اسلام کے بنیادی عقائد

۲

حصۂ دوم

نبوت

مؤلف

حجۃ الاسلام سید مجتبیٰ موسوی لاری

مترجم

حجۃ الاسلام مولانا روشن علی غروی

نام کتاب	اسلام کے بنیادی عقائد جلد دوم نبوت
مصنف	حجۃ الاسلام سید مجتبیٰ موسوی لاری
ترجمہ	حجۃ الاسلام مولانا روشن علی
خطاطی و تزئین	ہادی علی قمی اسکردوی
ناشر	دفتر گسترش فرہنگ اسلامی
تعداد	۳۰۰۰
تاریخ طباعت	ربیع الاول ۱۴۱۰ ھ ق
طباعت	اوّل

فہرست

عرضِ مترجم	۵
رسالتِ انبیاء (ع)	۷
مکتبِ انبیاء سے آشنائی	۸
قانون سازی کا حق کس کو ہے؟	۱۷
مکمل و فائدہ مند نظام	۲۷
ایک مستند سند	۳۶
مشرکین کی بے تکی باتوں کا جواب	۴۵
شناختِ وحی	۵۶
تبلیغ میں انبیاء کا ثباتِ قدم	۶۶
عصمتِ انبیاء	۷۲
آخری رسالت	۸۶
رسولِ اسلامؐ کی آمد	۸۷
آغازِ بعثت	۹۳
دشمنوں کے حربے	۱۰۰

آغازِ ہجرت	۱۰۴
بہتر قرآن شناسی	۱۱۴
قرآنی چیلنج	۱۲۳
دانش نو سے قرآنی رابطہ	۱۳۴
ایک عظیم حکومت کے شکست کی پیشین گوئی	۱۴۳
دوسرے واقعات کی پیشین گوئیاں	۱۶۵
مباحث قرآنی میں یگانگت	۱۷۱
قرآن کی ختم نہ ہونے والی خصوصیت	۱۷۶
قرآن کی گہرائی اور اس کا دائمی نفوذ	۱۸۳
آخری رسول کے لئے مسیح کی پیشین گوئی	۱۹۰
رمزِ جامعیت	۱۹۹
مادہ پرستوں کا جواب	۲۰۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم المرسلین وآلہ المعصومین واللعنۃ الدائمۃ علیٰ اعدائھم اجمعین۔

اما بعد:

اصول عقائد کی یہ دوسری جلد ہے۔ پہلی جلد کی کتابت ہو رہی ہے۔ تیسری جلد بھی مکمل ہو چکی ہے۔ یہ تینوں جلدیں حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید مجتبیٰ موسوی لاری دام ظلہ کی تالیف ہیں۔ اور ان کا ترجمہ حقیر نے کیا ہے۔ ان کتابوں کا ترجمہ عربی و انگریزی میں ہو چکا ہے اب اردو میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب میں بحث امامت نہیں ہے کاش وہ بھی ہوتی تو کتاب کو چار چاند لگ جاتے[1]! یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت اچھی ہے "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" کے مصداق میرے کہنے کی

---

۱ ۔ اپریل ۸۶ء میں معصومہ قم کی زیارت کیلئے جب گیا تو سرکار لاری سے ملاقات ہوئی آپ نے فرمایا: "بحث امامت" بھی فارسی و عربی میں چھپ چکی ہے اردو میں اس کا ترجمہ ہونا باقی ہے۔ مترجم

بار نہیں آپ مطالعہ فرمائیں گے تو خود ہی فیصلہ کریں گے۔

البتہ اس کے ترجمہ میں اشتباہات ہو سکتے ہیں کیونکہ عصمت تو صاحبانِ عصمت ہی کے لئے مخصوص ہے اس لئے میری خواہش ہے کہ پڑھنے کے بعد ان غلطیوں کی نشاندہی ضرور فرما دیں تاکہ بعد کے ایڈیشنوں میں وہ کوتاہیاں نہ رہ جائیں۔ غلطیوں پر تبصرہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ مؤلف یا مترجم کو اس سے مطلع فرما دیں۔ یہ آپ کی مہربانی ہوگی۔

تیسرا حصہ اپنے مطالب کے لحاظ سے مجھے کچھ زیادہ ہی جاذبِ نظر معلوم ہوا اس لئے اس کا ترجمہ دوسرے حصہ سے پہلے ہی مکمل کر دیا تھا۔ اب یہ دوسرا حصہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ دیگر تراجم کی طرح یہ ترجمہ بھی مکہ مکرمہ میں اختتام پذیر ہوا بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ آج عید غدیر کے دن مکمل ہوا۔

پروردگار عالم کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ اس حقیر ترجمہ کو قبول فرمائے اور اس کو اس دن کے لئے میری بخشش کا ذریعہ قرار دے جس دن کے لئے قرآن نے کہا ہے يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ۔

نیز بارگاہِ احدیت میں دست بدعا ہوں کہ جس طرح اس کتاب کے ترجمہ کی توفیق مرحمت فرمائی ہے اسی طرح ایسے اسباب بھی مہیا فرما دے جو جلد از جلد کتابت و طباعت کی منزلوں سے گزر کر قارئین کے ہاتھوں میں پہونچ جائے۔

والسلام

روشن علی

۱۲ اگست ۱۹۸۷ء مطابق ۱۸ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ

روز چہارشنبہ - مکہ مکرمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکتبِ انبیاء سے آشنائی

اس دنیا میں جہاں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ کبھی سنا ہے کہ کوئی ادارہ اپنے مدیر کے بغیر چلتا ہو۔ کیونکہ انسانی عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ کوئی اجتماعی ادارہ کسی رئیس و سرپرست کے بغیر ہو۔ اور کوئی بھی عقلمند ان اداروں کو صحیح ماننے پر تیار نہ ہوگا جن کا نہ کوئی مدیر ہو اور نہ کوئی مسئول۔

جب چھوٹے چھوٹے اداروں، اجتماعی سازمانوں کے لئے منطق اور عقل، سرپرست اور مسئول کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے تو پھر بشری معاشرہ کسی رہبر و پیشوا کے بغیر اپنے اصولی مقاصد تک کیونکر پہونچ سکتا ہے؟ اور جو چیزیں اس کے لئے لائق و سزاوار ہیں انکو کیونکر حاصل کر سکتا ہے؟

پروردگار عالم نے ہر موجود کو اس کی بلندی اور مناسب کمال تک پہونچنے کے لئے نظام آفرینش میں ذرہ برابر کمی جائز نہیں رکھی بلکہ ایسے وسائل و ذرائع بھی ہر موجود کے قبضے میں دیدیئے جس سے وہ اپنے کمال لائق تک پہونچ سکے، بلکہ ہر جاندار و نباتات کے اعضاء میں جس عضو کو جس چیز کی ضرورت تھی اسکو مرحمت فرمایا پھر نظام تشریع کے اندر " بعثت انبیاء " جیسے اہم ترین مسئلہ کو جو کمال انسانیت کے لئے مختلف جہات سے ضروری ہے اور حساس و بنیادی رکن ہے۔ اسکی طرف کیونکر توجہ نہ کرتا اور اس کو یوں ہی چھوڑ دیتا؟

دوسری طرف کیا کوئی صاحب عقل اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ اتنی عظیم کائنات ہستی اپنی تمام حیرت انگیز مظاہر کے باوجود ایک بے مقصد بنیاد پر قائم کی گئی ہے؟ اور کیا اس بے مقصد کائنات کی نسبت خدا کی طرف دی جا سکتی ہے؟ ایک علمی اصل جو مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ فکر وارادہ وزندگی کا لازمہ مقصدیت ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ ایک خردمند جان بوجھکر کوئی ایسا اقدام کرے جو بے مقصد ہو۔

تو کیا وہ خدا جو رحمت وشفقت کا بے پایاں سمندر ہے اس نے انسان کو بے لگام پیدا کیا ہے؟ کہ وہ ایکدوسرے کا خون بہائیں اور جو جرم چاہیں کریں دنیا کو جہنم بنادیں مگر انسان سے کوئی پرسش نہیں ہوگی؟

اگر اس کائنات کے اندر انسان کو بے لگام کر دیا گیا ہوتا تو ہر شخص اپنے سلیقہ اور مزاج کے مطابق فیصلہ کرتا، جو چیز پسند ہوتی اور مزاج کے موافق ہوتی اسی کو بجا لاتا اور ہر شخص اسی راستہ پر چلتا جس میں اس کا فائدہ ہوتا تو اس کا نتیجہ بھی فساد، ہرج مرج، فردی واجتماعی روابط کے ٹوٹ جانے پر اختتام پذیر ہوتا۔

❂

فرانسیسی رائٹر امیل درمنگام EMIL DERMENGAM اپنی کتاب "حیات محمد" میں لکھتا ہے: جس طرح سورج، بارش، سردیوں کے طوفان ـــــ جو خشک وبے حاصل زمین میں شگاف پیدا کر کے زمین پر سبزیوں اور سبزہ زاروں کا بستر لگا دیتا ہے ـــــ ضروری ہیں اسی طرح پیغمبروں کا وجود بھی دنیا کے لئے ضروری ہے۔

اس قسم کے حوادث کی عظمت وحقانیت کا فیصلہ ان کے نتائج سے کرنا چاہیئے جیسے وہ صلاحیتیں جو مضبوط اور محکم ہوئی ہیں، وہ دل جن کو سکون نصیب ہوا ہے، وہ ارادے جو طاقتور ہو گئے ہیں، وہ پریشانیاں جو سکون پذیر ہوئی ہیں، وہ اخلاق

بیماریاں جن کو شفا نصیب ہوئی ہے ۔ وہ دعائیں جو آخر کار آسمان تک پہونچیں ان سے عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ (۱)

مکتب الٰہی میں عقیدہ و عمل کے ماتحت جو غور و فکر ہوتی ہے وہ ادراک کے حدود و ظرفیت کے اعتبار سے ہوتی ہے ۔ اسی لئے اس وقت تک انسان اپنی سعادت واقعی تک نہیں پہونچتا ہے اور نہ کمال و پختگی تک پہونچتا ہے جب تک کہ پہلے اپنے بنیادی مطالب اور حقیقی خواہشات کی معرفت نہ حاصل کر لے اور اس کے بعد معقول طریقہ سے اس پر عمل نہ کر لے اور جب ایسا کر لیتا ہے تب ہی انحراف سے محفوظ رہتا ہے

انسان کے لئے سب سے زیادہ رنج و عذاب کا باعث اس کی سرکشی ، تمردی اور راضی نہ ہونے والی روح ہے ۔ اور انبیاء کرام کے منظم پروگراموں میں بنیادی پروگرام اسی قسم کی تندروی پر کنٹرول کرنا ہے اور ان سرکشیوں کو سکون بخشنا ہے اسی لئے ان حضرات ۔ انبیائے کرام ۔ نے نہ تو لذتوں سے ممانعت فرمائی ہے اور نہ لذتوں کی قدر و قیمت کا انکار فرمایا ہے ۔

انبیائے کرام ۔ جو اخلاق انسانیت کے جوش مارتے ہوئے سمندر اور فضیلتوں کے مرکز ہیں ۔ کی خواہش یہ رہی ہے کہ روح بشر کا علاج اور تغذیہ اس طرح کریں کہ وہ برتر حقیقت اور اخلاقی قدر و قیمت کے لحاظ سے اوج کمال پر پہونچ جائے اور ان کے زیر سایہ اس خدا کی طرف گامزن ہو جائے جس کی انتہا نہیں ہے اور (یہ بھی خواہش رہی ہے کہ) بیگانگی سے دور ہو جائے ۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے انبیاء کو اس خدا کے آستان ملکوت کا نمائندہ ہونا چاہیئے جو انسان کی تمام روحانی ضرورتوں اور تمام اسرار آفرینش سے آگاہ ہو ۔

---

(۱) مسئلہ وحی ۔ صفحہ ۳۱

بالخصوص ایسے ہی لوگوں کو پیغمبری کے لئے خدا منتخب کرتا ہے جو بشری استعداد و صلاحیت کے کامل ترین نمونے ہوں اور انسان (بھی) اپنے وجود کی برتری اور شفائے جان، اور آسمانی آبرو مندی بارگاہ تک پہونچنے کے لئے انکی تعلیمات کی پابندی کرے۔ تب انسان کی انسانیت مرتبۂ کمال تک پہونچتی ہے۔

اس کائنات کے اندر انسان کا کردار نہ تو عنصر نہ مطرود و منفی ہے اور نہ ہی خدانخواستہ انسانوں کی قسمت کا فیصلہ ان ہوس پرستوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے زہر آلود چنگل کو انسان کی فکر و روح میں گڑو کر اپنے مقاصد کو انکی فکری استعداد سے آغاز کرتے ہیں، تاکہ لوگوں کو تکامل واقعی سے روک کر اپنی لچر و بیہودہ خواہشات کی طرف کھینچ سکیں۔

چونکہ عقیدہ و فکر زندگی عطا کرنے میں بہت ہی مؤثر عامل ہیں اسلئے انبیائے کرام بھی اسی راستہ سے میدان میں داخل ہوتے ہیں اور معاشرہ کے فکری معیار — جو زیادہ تر جاہلی رسوم سے متاثر ہوتی ہے — کو توڑ کر نئی مثبت و پربار فکر سے معاشرہ کو آشنا کراتے ہیں۔

یہ انقلاب گران تاریخ — انبیائے کرام — تاریکیوں سے جھکتے ہیں اور فکری مرکز فساد و گمراہی سے جنگ کر کے انسان کی مقدس ترین و زیبا ترین اصل روح کو سیچے اور واقعی راستہ کی طرف ہدایت کر کے، تنگ آذر پوجا پاٹ سے اور بت پرستی سے رہائی دلا کر کج فکری، انحراف اور انکی خسارتوں سے باز رکھتے ہیں اور سرحد جہل سے نکال کر منطقۂ نور کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کیونکہ تمام نیک بختوں اور نجات کے راستوں کا اختتام توحید پر ہوتا ہے۔ اگر ہم انبیائے کرام کی تعلیمات کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم

ہو جائیگا کہ ان کا مقصد صرف انسانیت کو نیک بختی تک پہونچانا ہے۔

چونکہ پروردگار عالم اپنے بندوں پر نظر عنایت رکھتا ہے اس لئے انسانوں میں کامل ترین اشخاص کو اپنی رسالت کے لئے منتخب کرتا ہے تاکہ جب یہ حضرات معاشرہ کے عقیدہ و فکر کے میدان میں قدم رکھنے کی ابتدا کریں تو ایک عظیم راستہ ایجاد کریں اور پھر عمل و اخلاق کے میدان میں داخل ہوکر لوگوں کی توجہ کو طبیعت سے ماورائے طبیعت کی طرف موڑدیں اور بشریت کو رنگ برنگ معبودوں کی طرف سجدہ ریز ہونے سے۔ دنیا کی وابستگی سے، مظاہر مادیت سے آزاد کرائیں اور دلوں کو اور فکروں کو پاک بازبنائیں۔ اور خدا کی رحمت و رأفت کا امیدوار بنائیں۔

حضرت علی (ع) ارشاد فرماتے ہیں: بجا جائے فطرت کو دور کرنے کے لئے اور انسان کے فکری خزانوں کو ظاہر کرنے کے لئے خداوند عالم نے انبیاءؑ کو مبعوث فرمایا ہے۔(۱)

نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں: پروردگار عالم نے اولاد آدم سے انبیاء مبعوث فرمایا اور تبلیغ رسالت کے لئے ان سے عہد و پیمان لیا۔ اور یہ اس کے بعد ہے کہ جب زیادہ تر لوگ عہد الہی کو تبدیل کرچکے تھے اور مقام حقیقت سے جاہل ہو چکے تھے اور خدا کے لئے شبیہ و نظیر بنا لئے ہوئے تھے اور شیطان انکو فطرت کے راستہ سے الگ کرچکا تھا اور خدا کی عبادت سے روک چکا تھا ــــــ اس وقت خداوند عالم نے لوگوں کی طرف پے در پے انبیاء بھیجے تاکہ وہ حضرات لوگوں کو بھولی ہوئی نعمتوں کو یاد دلائیں۔ اور لوگوں سے فطرت کے پیمان ادا کرنے کی خواہش کریں اور چھپے ہوئے بشری خزانوں کو اور درخشاں نشانیوں کو جو بدل چکی

۱ــ بحار الانوار ج ۱۱ ص ۶۰

تھیں آشکار کریں۔

انبیاء خدا نے جس مکتب کی بنیاد ڈالی ہے وہ ایک قسم کی جہان بینی وجامعہ بینی پر مشتمل ہے۔ جو آدمی کے افکار کو ایک مخصوص ڈھرے پر لے چلتی ہے سب سے پہلا درس اور بنیادی عقیدہ تمام آسمانی مذاہب میں "توحید" ہے۔

ابتدائے بعثت ہی سے انبیاء صدائے توحید کو بلند کرتے ہوئے افکار انسان کو قید وبند اوہام سے رہائی، تذلل وسرسپردگی، جھوٹے خداؤں کے سامنے جبین سائی سے آزاد کرانے میں لگ جاتے ہیں۔ اور تھوڑی سی مدت میں خدائی پیغام کو زن ومرد، پیروجوان، حکام وکمزور وطاقت ور (بلکہ) اپنے زمانہ کی تمام انسانی آبادی کو پہونچا دیتے ہیں اور انسانوں کو قید غلامی سے آزاد کرانے میں اور آدمیوں کے عقل وخرد کے سہارے جہل ونادانی کے پردے چاک کرنے میں کمر ہمت باندھ لیتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ توحید کے سایہ میں معاشرہ کو شاہراہ رشد پر گامزن کرادیں۔ اور روح ملت کے مرکز پر جو بھی غیر خدائی رنگ چڑھا ہے اسکو دھوڈالیں۔

فلسفیوں کی طرح انبیاء کرام نے صرف افکار کی پرورش پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ عقل کی طہارت کے بعد خانۂ دل میں عشق حقیقی کا چراغ روشن کیا اور یہ وہی عشق ہے جو انسان کو شور والتہاب وتحرک پر آمادہ کرتا ہے اور انہیں چیزوں کے ذریعہ زندہ وپائندہ انسان پیدا کرتا ہے۔

درحقیقت درگاہ ومنبع لامتناہی کا عاشق وشیدائی ہونا ہی حیات کی مشین ہے اور اگر یہ چیز انسان کے ہاتھ سے نکل جائے تو پھر انسان ایک بے حرکت وجامد پیکر بن کر رہ جاتا ہے۔

یہی اصل توحید معاشرہ کی عمارت کو داخلی وخارجی مناسبات کے اعتبار

سے تمام معاشروں سے جدا و متمیز کر دیتی ہے اور توحیدی معاشرہ کے انتظام و انصرام میں ایسا اہم کردار ادا کرتی ہے کہ فرد و اجتماع کے اصلاح کے سلسلے میں تاریخ بشر کا کوئی انقلاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اصل توحید علاوہ اس کے کہ انسان کے رابطہ کو خدا سے مشخص کرتی ہے ـــــ یعنی اس بنیاد پر پرستش کا انحصار صرف ذات خدا میں کر دیتی ہے ـــــ انسان کے اقتصادی، سیاسی، حقوقی روابط کو بھی معین کر دیتی ہے۔

اسلامی متون کے اندر مأموریت انبیاء کے سلسلے میں کلمۂ بعثت استعمال کیا گیا ہے جس کے اندر عجلت و سرعت عمل پوشیدہ ہے اور ایک بنیادی و عمیق حرکت کے لئے اس سے رسا تر اور لطیف تر کلمہ کا ملنا ناممکن سی بات ہے۔

۵

خدا کی توحید و یکتائی ہی سے وحدت حاکمیت ناشی ہوتی ہے۔ کیونکہ وضع قوانین و صدور احکام کا مرجع یگانہ ذات پروردگار عالم ہے۔ امر و نہی کا حق خالق ہستی سے مخصوص ہے اسی لئے توحید کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کو حق حکومت ہے اور نہ ہی کسی کو وضع قانون کا حق ہے۔ توحید خالص کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کائنات کے لئے صرف ایک خدا مانا جائے۔ بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ خدا کو واضع قوانین بھی تسلیم کریں۔ اور جب قانون گذار اور حاکم ایک ہی ذات ہوگی تو تمام خود سر۔ خائن۔ جابر حکام کا خاتمہ خود بخود ہو جائیگا

اور جو شخص اس حق کا مدعی ہوگا درحقیقت اس نے ادعائے الوہیت کیا ہے۔ کیونکہ شرک کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ بغیر کسی شرط کے وضع قانون کا حق اور حاکمیت مطلقہ کسی انسان کے لئے تسلیم کیا جائے یا خود انسان اس کا مدعی ہو کیونکہ یہ بات توحید اور ادیان کے اصولی عقائد کے خلاف ہے۔

آسمانی مذاہب کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کو نجات دینے کے لئے توحید خالص کے عقیدہ کی تبلیغ کی جائے۔ اور لوگوں کو باطل حکام کے قید و بند سے آزاد کرا کے توحید کے عقیدہ پر گامزن کیا جائے۔

۵

اگر ادیان الٰہی کی وسعت و گہرائی نہ ہوتی اور انبیائے کرام کی سعی و کوشش و صدائے آگاہانہ نہ ہوتی، اور انبیاء کے فکری و اجتماعی اصلی انقلاب کے زیر سایہ بشری معاشرہ کی وضع دگرگوں نہ ہوگئی ہوتی تو آج ہم کو انسانیت کی نشانی بھی نہ ملتی اور نہ منزلِ عشقِ حقیقی کی طرف ہم کو راستہ ملتا۔

پوری بشری تاریخ کے اندر عمومی طور سے صرف دین نے انسان کی مدد کی ہے اور لوگوں کو ترقی کی طرف نشاندہی کی ہے اور دانشِ بشری کی عمارت میں دین کے رہبروں کی کافی مدد شامل رہی ہے۔

دعوتِ انبیاء کی تاریخ کی دعوت پر نظرِ تحقیق اور رشدِ سریع اور بے مثال سعی و کوشش کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے معاشرہ کے اندر عمیق فکر پیدا کی۔ اور روحِ برادری، محبت، نوعِ دوستی کو انسانی جسم میں پھونکا اور عدالت، صلح، وحدت کی طرف بشر کی رہنمائی کی۔

اگر بشری تاریخ میں خدا کی طرف سے اس قسم کا اقدام نہ کیا جاتا تو بشریت ضلالت و گمراہی و زبوں حالی و بدبختی میں ہمیشہ ہاتھ پاؤں مارتی رہتی اور سرحدِ کمال و فضیلت تک کبھی نہ پہونچ سکتی۔ بلکہ جو لوگ انبیائے کرام کا انکار کرتے تھے وہ لوگ بھی انکی میراثِ پُربرکت سے محروم نہیں رہے۔

جنبشِ انبیاء اور دانشِ بعنائے مطلق کے درمیان ایک عمیق ارتباط کے علاوہ جس دور میں انقلاب کی رہبری مردانِ خدا کے ہاتھوں میں تھی نہضتِ علمی کے

اعتبار سے تاریخِ بشر کا وہ بہترین و درخشاں ترین دور تھا۔

اِن حضرات کی طرف سے جو مبادی اور اصول و طرزِ فکر پیش کیا گیا اس نے اجتماعی نظاموں میں ایک مناسب فکری و عملی ایسی زمین ہموار کی جس نے علوم کی پیشرفت میں کافی تعاون کیا۔ بلکہ دنیا کے بیشتر فلسفی و دانشمند حضرات نے اپنے عمیق تفکر کا ماٰخذ رہبرانِ توحید ہی کو قرار دیا ہے۔

اسپنسر Spencer کہتا ہے: مذہبی شخصیتیں جس طرح دنیا کے پہلے ادیب تھیں۔ اسی طرح دنیا کے پہلے دانشمند بھی تھیں۔ (۱)

۱۔ تاریخ ادیان

قانون سازی کا حق کس کو ہے؟

انسان کے اصیل و اندیشمند عنصر کو اس کرۂ زمین میں آغاز زندگی سے لے کر اس وقت تک جبکہ انسانی قوتِ فکر ایک بلند سطح تک پہونچ چکی ہے اگر نظر میں رکھتے ہوئے توانائیوں اور ناتوانائیوں اور مشکلات و دشواریوں کی تحقیق کیجئے کہ آیا وہ ان تمام خصوصیات کیساتھ اسپِ فکر پر سوار ہو کر صراطِ مستقیم اور راہِ تکامل کو طے کر سکتا ہے۔ اور اپنے کو فقدانِ اسباب کے باوجود سقوط انگیز انحرافات سے محفوظ رکھ سکتا ہے یا اور اپنے سرزمینِ وجود پر مربیانِ آسمانی کی ہدایت وارشاد سے استفادہ کئے بغیر ثمر فضیلت وتقویٰ کی کاشت کر سکتا ہے؟ اور اپنی فطرت میں چھپی ہوئی استعداد وشائستگی کو منزلِ مقصود تک پہونچا سکتا ہے؟ تو جواب ملے گا نہیں۔

اور اگر ابھی تک عملی طور سے اپنے ان ارمانوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا تو پھر آئندہ بھی اس کے کرنے کی طاقت نہیں پا سکے گا۔

اگر چہ مستقبل میں اسکی توانائیوں میں اضافہ ہو جائیگا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسکی مشکلات و دشواریاں بھی زیادہ پیچیدہ ہو جائینگی جیسے کہ آج کی دشواریاں گذشتہ سے زیادہ ہو گئی ہیں۔

اس کے علاوہ عقل کی قلمرو داوری کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک بہت ہی محدود منطقہ ہے جو علم ودانش کی تابش سے روشنی یافتہ ہوا ہے۔ اور اس کے علاوہ سب کا سب ابہام وتاریکی کے پردوں میں لپٹا ہوا ہے اور ہمارے افکار کے دسترس سے

باہر ہے۔ حالانکہ انبیائے الٰہی کی تعلیمات کا بہترین حصہ مجہول و ناشناختہ حقائق ہی سے مربوط ہے اور ایسے حقائق کے بیان پر مشتمل ہے جو ہمارے حواس ظاہری کے حدود و اختیار سے باہر ہیں۔

انسانی وظائف اور مبدا رہستی سے آشنائی کے لئے ہم کو ایک ربانی معلم و رہنما کی ضرورت ہے تاکہ وہ ہم کو اپنی جامع تعلیمات کے ذریعہ کمال و ہدفِ آفرینش تک پہونچنے کی رہنمائی کرے۔ اور یہ بات انبیاء کے وحی و تعلیم کے ذریعہ ـــ جو ڈائرکیٹ مبدا رہستی سے ارتباط رکھتے ہیں اور جنھوں نے اپنے چراغِ عقل کو اس کے علم بے پایاں کے شعلۂ جاودانی سے روشن کیا ہے ـــــ کے بغیر ناممکن ہے۔

انبیاء کے تعلیمات کا دوسرا حصہ ہماری اصلاح اور ہمارے اشتباہات کا دور کرنا ہے کہ اگر کبھی ہمارے معلومات میں خطا یا اشتباہ ہو جائے تو ان حضرات کی رہنمائی سے ہمارے اشتباہات دور اور ہمارے معلومات کا نقص دور ہو جایا کرے۔ کیونکہ ان رہبروں کی مدد کے بغیر تنہا ہمارے لئے راستہ طے کرنا ممکن نہیں ہے۔

یہیں سے ہدایتِ بشر اور اسکا اوجِ کمال تک پہونچانے میں ہم کو انبیائے کرام کی خدمت و ماموریت کی اہمیت و قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۞

ہم سب کو معلوم ہے کہ بشر کی اطلاعات و علمی تکامل تدریجی ہیں۔ علم اگر انسان کو اصولِ تکامل کی نشاندہی کرنا چاہے تو اسکو سب سے پہلے تمام طاقتوں استعدادوں اور اندرونی رازوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہیئے۔ اور اس کے متنوع و مختلف ضرورتوں کو درک کرنا چاہیئے۔ آج دنیا کے وہ تمام مفکرین جو رشتۂ

تعلیم وتربیت سے منسلک اور جامعہ شناسی اور سیاست میں صاحب نظر ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ ہر قسم کی آئیڈیالوجی انسان کی شناخت کے بغیر بے فائدہ و غاقابل رد ہے۔

کیا درد کو پہچانے بغیر کسی بیمار دردمند کا علاج ممکن ہے؟ جس انسان کی حقیقت و ماہیت معلوم نہ ہو اور جو مجہولات کے انبوہ میں پوشیدہ ہو اس کے لئے وضع قوانین و برنامہ ریزی ایسی ہی ہے جس طرح درد پہچانے بغیر مریض کا علاج کرنا ہے۔

اور چونکہ ابھی تک کسی مکتب فکر نے انسان کی تبیین نہیں کی ہے اسی لئے اس سلسلہ میں جو بھی قانون بنایا جائیگا وہ ناکامی سے دوچار ہوگا۔

بے شمار موجودات اور گوناگون نظام ہستی کے اندر انسان جو ایک بہت ہی چھوٹا سا موجود ہے اس کے اسرار آفرینش پر آگاہی کے لئے جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں، اور اس سلسلہ میں تحقیقاتی کمیٹیوں نے اپنے جتنے باریک و پیچیدہ آلات استعمال کئے ہیں ان سب کے باوجود کوئی بھی شخص اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ ان تمام کثیر معلومات کے باوجود ابھی تک بہت سی چوٹیاں خصوصاً روحانی اور انسان کی اندرونی دنیا میں تسخیر نہیں ہو سکی ہیں۔ اور ہم ابھی تک ان سے مکمل طریقہ سے بے خبر ہیں۔

ممکن ہے انسان بہت سے علمی و فنی حقائق پر آگاہ ہو۔ لیکن اپنے حدود کی شناخت بہرحال ابھی تک "مسئلۂ ناآگاہ" ہے۔ اور اس کی تمام معلومات اس "مسئلۂ ناآگاہ" کے مقابلے میں صفر ہیں۔ اندیشۂ خویش و دستگاہ ادراک کی محدودیت کی جہالت ہی بے حساب نادانیوں کا منشا رہوتی ہے۔ اور اس بات کا سبب بنتی ہے کہ انسان بہت سے حقائق سے منہ موڑے۔ اور بہت سی

واقعی چیزوں کی طرف سے روگردانی اختیار کرے۔

اور اگر جسمی مطالعات کے تمام مبہم نقاط انسان کو معلوم ہو چکے ہوتے تو تمام دنیا میں ملیونوں دانشمندوں کی تحقیقاتی اداروں کی طرف سے جو مسلسل محنت ہو رہی ہے وہ سب بیکار و بے مصرف ہوتی۔

فرانس کے مشہور عالم ڈاکٹر کارل Karl کہتے ہیں: ہم چاہے جتنی فکر کریں اس کائنات کو اپنی فکر سے قریب نہیں کر سکتے ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہمارے بدن کے ٹکڑوں کا انتظام ان ہزار ہا ہزار مشینوں سے کہیں زیادہ حساس ہے جس کو بہت سے ایکسپرٹ حضرات مل کر چلاتے ہوں۔

اگر ہمارے عقیدے کی تحقیر یا توہین نہ کی جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ تمام اطباء اور ایکسپرٹ حضرات جو اپنے فن میں زحمت کرتے ہیں ان سب کا عقیدہ ہے کہ جتنی معلومات ہم کو اب تک حاصل ہوئی ہیں وہ بعد میں پیدا ہونے والے مسائل کے مقابل میں بالکل ہی ناچیز و بے اہمیت ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان ایک ایسے مجموعہ کا نام ہے جو ناقابل تفکیک، مبہم و بہت پیچیدہ ہے جس کو آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا اور ابھی تک ایسے وسائل و ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں جن سے اسکو اجزاء اور مجموعہ اور محیط خارج سے بین روابط کی صورت میں اس کی شناخت کر سکیں۔ کیونکہ اس قسم کے مطالعہ کے لئے فراوان تکنیک اور مخصوص علوم کی ضرورت ہے۔ اور یہ علوم بھی صرف اس مجموعہ کے ایک جزو یا ایک جنبہ کا مطالعہ کر کے مخصوص نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ اور جہاں تک وہ تکنیک اجازت دے اسی حد تک آگے بڑھ سکتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ تمام انتزاعی مفہوم آدمی کے سلسلہ میں درک واقعیت سے قاصر ہیں کیونکہ ابھی تک مبہم و قیمتی نکات تاریکی ہی میں ہیں۔

کالبد شناسی، علم شیمی، فیزیالوجی، روان شناسی، علم تربیت، تاریخ، اقتصاد، اور انکے مختلف شعبے آدمی کے کنہ وجود تک نہیں پہونچ سکے ہیں۔ اسی لئے (یہ کہا جاسکتا ہے کہ) ان علوم کے اکسپرٹ حضرات نے بھی انسان کو جتنا پہچانا ہے وہ واقعی نہیں ہے بلکہ یہ انھیں علوم کی ساختہ وپرداختہ تکنیک کی شبیہ ہے۔(۱)

یقیناً انسان اپنی حیرت انگیز فعالیت کی بنا پر ایک عمیق دریائے ناپیدا کنار ہے اور طبعاً انسان کے بارے میں ہمارے معلومات کی دنیا بہت ہی ناچیز و مختصر ہے بھلا کون ایسا شخص ہے کہ انسان کے تمام جزئیات درونی اور تمام استعداد کے کشف کر لینے کا دعویٰ کر سکے؟ اور کون ہے جو اس کے تمام ان مراحل کمال سے آگاہ ہو سکے جو اس کے لئے ممکن ہیں؟

انسان کے بارے میں ہماری معلومات گویا جہالتوں کے بحر اوقیانوس کے مقابلہ میں ایک قطرہ ہے جو شک و تردید سے خالی نہیں ہے۔

حدِ توانائی بشر اور اسکی مقدار اور جہان و انسان کی وسعت و یکرانگی کا مسئلہ وہ حیرت انگیز مسئلہ ہے کہ آج علم اس سے دوچار ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا تنہا علم دانش تکامل انسان کی رسالت کا عہدہ بردار ہو سکتا ہے؟ کیا وہ کائنات جو ہستی کی حقیقی شناخت نہیں رکھتی اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ موجود جسم و جان کے اعتبار سے کیا ہے؟ اور تمام وہ کیفیات مرموز اجتماعی جو اسکے روحانی و جسمانی خصوصیات کی تزئین ہیں ان سے بھی آگاہ نہیں ہے۔ کیا اس میں اتنی طاقت ہے کہ اندیشہ وخرد کے بازتاب شدہ قوانین "جو ابعاد گوناگون میں انسان کی واقعی ضرورتوں

۱۔ انسان موجود ناشناختہ صفحہ نمبر ۲۔۳۔۷۔۲۹۱

کی شناخت کی نہیں حاصل کر سکے ») اس کے لئے وضع کر سکے۔ جو انسان کی حقیقی سعادت کی ذمہ دار اور تمام قسم کی ضرورتوں کی جواب دِہ ہو سکے تاکہ اس کے بعد بشریت اس راستہ کو اختیار کرے جو اس کیلئے سزاوار ہے ؟

۵

جب تک ہم کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ کس کے لئے، کس جہت میں ہم کو کیا بنانا چاہیئے اس وقت تک ہم پروگرام کیونکر طے کر سکتے ہیں اور کس طرح بنا سکتے ہیں ؟

تمام وہ مکاتیب فکر جو انسان کو خود رو بنانے کے مدعی ہیں وہ انسان ناشناختہ کو کیونکر خود رو بنائیں گے ؟ اور کس طرح اس کو ایسا موجود ثابت کر سکیں گے جو تمام خصوصیات کا از خود حامل ہو ؟

دراصل آج کی بشریت کا بنیادی درد صرف طاقت حاصل کر لینا نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے سامنے جو مختلف راستے موجود ہیں اُن میں سے کس کو اختیار کرے ؟ کیونکہ بہت سے ایسے علمی مسائل و مباحث جو گذشتہ مفکرین کے نزدیک متفق علیہ تھے۔ لیکن استداد زمانہ اور علمی ترقی کی وجہ سے وہ آج باطل ہو چکے ہیں۔

اگر دنیا کے قوموں کی قانون سازی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ بہت سے وہ قوانین جو بہترین دماغوں نے دقتِ نظر، طولانی مطالعات اور علمی و فکری فراوان امکانات سے استفادہ کر کے بنائے تھے۔ وہ امتدادِ زمانہ اور دقیق تر علمی مباحث کے بعد آج ان کی کوتاہیاں اور اشتباہات واضح ہو چکے ہیں اور کل کے معاشرہ کے لئے جن کا فائدہ مند ہونا مسلّم تھا آج ان کا نقصان دِہ ہونا متفق علیہ ہو چکا ہے۔

اور اب ان قوانین کی جگہ جو نئے قوانین لیں گے اور جو مکمل فکر و علم کی روشنی میں بنائے جائیں گے۔ مستقبل میں وہ بھی محتاج اصلاح ہو جائیں گے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام وہ قوانین جو انسانی ذہن و دماغ کے بنائے ہوئے ہیں سب کے سب غیر مفید و باطل ہیں۔ بلکہ بحث یہ ہے کہ ایسے نظام جو اشتباہ اور خطا سے محفوظ نہ ہوں کیا وہ انسان کی تمام ضروریات کی ذمہ داری لے سکتے ہیں؟ اور معاشرہ کی رہبری کر سکتے ہیں؟

ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ساری دنیا کے نظاموں میں نقص و کمی ہے کیونکہ مادی و معنوی کمیاں، اختلاط آمیز و شخصیت کش انواع واقسام کی آلودگیاں ان مقررات کے معلول ہیں جنھوں نے انکے افکار سے سرمایہ اخذ کیا ہے اور یہ اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ بشری قوانین بہر حال ناقص و سخت آسیب پذیر ہیں۔

انتہا یہ ہے کہ اصول تکامل کے شناخت کے باوجود علم و اندیشہ میں اس کی صلاحیت نہیں ہے کہ انسانوں کی بلند رسالت کا تنہا ذمہ دار ہو سکے بلکہ اس رسالت کے انجام کی بنیادی شرط منفعت طلبی، ہوا و ہوس سے دور ہونا بھی ہے اور یہی عوامل انسان کو اپنی شناخت سے مانع ہو جاتے ہیں۔

انسان کا اپنی ذات سے اور اپنے تمام منافع سے اور ان چیزوں سے کہ جو اس سے ارتباط رکھتی ہیں عشق و محبت اتنی گہری ہے کہ وہ گوناگون مسائل کو جان بوجھ کر یا نا سمجھی میں ـــ وسیع سطح پر بنظر مصلحت دیکھتا ہے۔ اور یہی حب ذات اس سے واقع بینی کو سلب کر لیتی ہے۔ بلکہ کبھی تو تعقع پرستی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ ایک طاقتور مخرب اور شرافت سوز عامل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ہر وقت ضابطے کے توڑنے، دوسرو

کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی فکر میں لگ جاتا ہے تاکہ تمام فائدے خود ہی حاصل کر لے اور پھر اس کی کوئی ضمانت نہیں رہ جاتی کہ وہ الگ تھلگ ہو کر مسائل کی تحلیل اور مبنی بر انصاف قانون سازی کر سکے گا۔

کیا فردی و گروہی نظام پردازان جنھوں نے انسان کی تحقیق و تفتیش کی ہے وہ انسان کے درد اور اس کے علاج کو بھی جانتے ہیں؟ اور کیا وہ خود پرستی کے جال سے آزاد ہو چکے ہیں؟ کیا منفعت طلبی، اشتباہ، تبعیض گرائی کی، ان کے یہاں گنجائش نہیں ہے؟ کیا وہ ان تمام گروہوں سے جو سطح زمین پر پھیلے ہوئے ہیں انکے درد اور درمان سے مکمل طور سے آشنا ہیں؟ اور کیا وہ ارباب نفوذ و اقتدار اور سیاہ دل جذبات کے بھڑکانے والوں کی تہدید اور ان کے فریب اور ہوا و ہوس سے بالکل محفوظ ہیں؟

اور کیا سوالات کی بوچھار میں یہ آئیڈیل و مثبت عنصر ثابت ہو سکتے ہیں؟ خلاصہ یہ ہے کہ ایک مشکوک سسٹم کو تسلیم کر کے اور اس کی پیروی کر کے اعتماد کے ساتھ اپنی سعادت کی پوری ذمہ داری اس کو کیونکر سونپی جا سکتی ہے۔

اگر یہ تمام نظام انسان کے درک و انتخاب اور تمام استعدادوں کی تنظیم و تعدیل کے لئے ہے تب تو یہ بہت ہی اونچی چیز ہے۔ مگر پھر منظم ہونے والا منظم کرنے والا کیونکر ہو سکتا ہے؟

اگر منظم ہونے والا ایک تعدیل کنندہ نظام بنانا چاہتا ہے تو پھر اسکو بھی نفوذ ناپذیر کی چار دیواری میں محفوظ ہونا چاہیئے تاکہ انحراف و اشتباہ کے عوامل کی رسائی اس تک نہ ہو سکے۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟ اور کیا انسان کی عقل و قوت ادراک اور اس کے امکانات اتنے ہیں کہ وہ ایک ایسا ــــ یا کئی ایسے ــــ نظام بنا دے جو انسان کے ابعادِ گوناگون کا کفیل ہو اور تمام گروہوں کے تمام

حالات کو منظم کردے اور اس کی موجودہ بے سروسامانیوں کو اور آئندہ مشکلات کو حل کردے ؟

یہی وہ اسباب ہیں جن سے ثابت ہوجاتا ہے کہ علم وفکر کی ناتوانی اس قسم کی رسالت کی انجام دہی سے عاجز ہے ۔ بلکہ اگر علم کبھی اس قابل ہو بھی جائے کہ وہ وجودِ انسان کے تمام گوشوں کو منور کرسکے اور نا سلجھنے والی گتھیوں کو سلجھا بھی لے پھر بھی چونکہ انسان فطرتاً منفعت جو اور اپنی خواہشاتِ نفس کی طرف مائل رہنے والا ہے اس لئے انسانوں کی سعادت کی ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ۔

نیز یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ قانون بنانیوالے قانون سازی کرتے وقت اکثریت کی خواہش (یا مفاد) کو پیش نظر رکھتے ہوئے قانون بناتے ہیں وہ حقیقت کو کبھی بھی پیش نظر نہیں رکھتے چاہے وہ اس وقت اپنا فائدہ ملحوظ نہ بھی رکھتے ہوں ۔۔ مکتب ہائے فکری کی کمی اس بات سے بھی ظاہر ہوجاتی ہے کہ لوگوں کے ضدِ تکامل وضدِ مصالح عوامل دونوں پانی سے سر نکالتے ہیں ۔

جان جاک روسو کہتا ہے : ایک ایسا قانون جو دنیا کے تمام ملتوں کے لئے مفید ہو اس کے لئے ایک عقلِ کل کی ضرورت ہے کہ جو انسانی خواہشات کو دیکھتی ہو مگر خود بے حس ہو ۔۔ یعنی ان خواہشات سے مبرا ہو ۔۔ اور طبیعت سے کسی قسم کا رابطہ نہ ہو لیکن طبیعت کو مکمل طور سے پہچانتی ہو ۔ اس کی کوئی سعادت ہم سے مربوط نہ ہو لیکن ہماری سعادت میں مددگار ہو (۱)

۱۔ قرارداد ہائے اجتماعی صفحہ نمبر ۸۱

ڈاکٹر کارل Dr. Karl کہتے ہیں: حکومتی سسٹموں کے انواع واقسام بھی جو نظریاتی تصورات و فکر کی ساختہ و پرداختہ ہیں وہ ایک بوسیدہ قصر سے زیادہ اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ اور جو شخص فرانس کے انقلاب کبیر کے اصول کو اپنا مقصد بناتا ہو یا جو لینن اور مارکس کے نظریہ کے مطابق آئندہ معاشرہ کی تعمیر کرنا چاہتا ہو تو (اسکو یہ جان لینا چاہیئے کہ) یہ دونوں غیر واقعی ہیں۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ایسے قوانین جو تمام آدمیوں کے لئے ایک دوسرے سے مناسب ہوں ابھی تک انکی شناخت نہیں ہو سکی ہے۔ علم اجتماع اور اقتصاد ناقص علم ہیں بلکہ در حقیقت یہ علم کے مشابہ ہیں علم نہیں ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ علم کی مدد سے ہم نے جو محیط بنایا ہے وہ بیکار ہے۔ کیونکہ یہ بطور اتفاق اور آدمی کی طبیعت کی مکمل شناخت کے بغیر ایجاد ہوا ہے۔(۱)

۱۔ انسان موجود ناشناختہ ص ۳۰

مکمل و فائدہ مند نظام

واقعی زندگی کا مقصد اور منزل سعادت تک رسائی کے لئے ایک پیغامبر کی ضرورت کا احساس ہے تاکہ وسیع تر انداز سے پر تصرف کیا جا سکے اور ناشناختہ زمینوں تک کا سفر کیا جا سکے۔

انسان خواہ اپنی ذات میں یا اس دنیا میں جہاں بسر کرتا ہے اپنے ان تمام وسیع امکانات کو جو اس کے اختیار میں ہیں استعمال کر کے ہدایت و رہبری کے سہارے ایک ایسا نظام قرار دے لے جو خداوند عالم کی طرف سے خطا و انحرافات سے محفوظ ہو تو پھر یہ بات طے شدہ ہے کہ ایسا نظام انسانوں کے مصالح واقعی ــــ مادی و معنوی کا ــــ کا ذمہ دار ہوگا۔

انبیائے کرام کی اپنی طرف دعوت دینے کی کوشش صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ لوگوں پر خدائی حکومت قائم ہو جائے جو ایک عادل ترین نظام حکومت ہوتا ہے اس نظام میں بطور کلی انسان کی انسان پر حکومت اور دیو سیرت ظالم حکمرانوں کے چنگل میں گرفتاری سے نجات مل جاتی ہے۔ بلکہ انبیاء کی باتوں کا اعتبار و نفوذ بھی صرف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ پیام الٰہی کے حامل ہیں۔

انسانی واقعیت اور واقعی انسان کی شناخت ہی جہاں بینی کی بنیاد اور مکتب ہائے الٰہی کی برنامہ ریزی کو تشکیل دیتا ہے۔ جس مکتب کی بنیاد آفرینش انسان پر رکھی گئی ہوگی اور وہ (مکتب) تمام ابعاد وجود کو پہچانتا ہوگا۔ اور انسان

کے تمام طبعی خصوصیات کو پیش نظر رکھتا ہوگا اس میں با قاعدہ اس کی صلاحیت ہوگی کہ جب وہ قانون سازی کریگا تو کسی بھی بنیادی مسئلے کو اپنی نظر سے دور نہ رکھے گا۔ تمام فرد پرستیوں، شہرت طلبیوں، طبیعت کی قوتوں پر تسلط جوئیوں کے برخلاف صرف ارادۂ الٰہی کے پیش نظر انبیائے کرام کا انقلاب ہوا کرتا ہے انکے انقلاب کا سرچشمہ خدا کی ذات ہوتی ہے۔ انبیاء کے موثر ہونے کا بنیادی نقطہ انسانوں کی محدود اندیشی ہے۔ انبیاء کی ساری کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ اصل ایمان کے اعلان کے بعد انسان کی تنگ نظری کو وسعت دیں اور نتیجہ خیز افکار پر آمادہ کریں۔

انبیاء کے نظام میں سب سے واضح نشانہ عدالت کو اس کے واقعی مفہوم کے ساتھ رائج کرنا ہوتا ہے۔ اس نظام کے اصول میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ معاشرہ کی وہ مناسبات جو انسان کے باطن کی اصلاح کر سکیں انکو انصاف پسندانہ طریقے سے برقرار رکھا جائے۔ اور برادری کی بنیاد پر انسانوں کی برابری قائم کیجائے اسی لئے عدالت اجتماعی کا واقعی مفہوم پیام الٰہی کے بغیر کسی طرح امکان پذیر نہیں ہے۔

دوسری طرف انبیائے کرام انسان کی آزادی کو دل کی گہرائی سے چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے وہ حضرات "ان زنجیروں کو جو انسان کی استعداد و طاقت و ارادوں کو مقید کرنا چاہتی ہیں اور انسان کے جوش کو توقف سے بدلنا چاہتی ہیں" توڑ ڈالتے ہیں۔ اور اندرونی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کا پیغام سناتے ہیں اور جباران دہر کی قید سے نجات دلاتے ہیں۔

اور جب انبیاء کی حکومت ہو تو نہ ناقص قوانین کی گنجائش ہوگی نہ اشتباہ آمیز خبر ہوگی نہ حکمرانوں کی ہوس آلود سلطنت ہوگی نہ قہر آلود ارادہ ہوگا اور جب

خدا قانون ساز ہوگا تو چونکہ اس نے کائنات اور کائنات والوں کو پیدا کیا ہے لہٰذا کامل و دقیق شناخت کے ذریعہ اس کو علم ہے کہ کس طرح آدمی کی ضروریات کی وسیع پیمانہ پر ذمہ داری لی جا سکتی ہے۔

اور اس وقت جہالت، کم علمی، معمولی سا ظلم و ستم، بے انصافی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ یہاں پر خود پرستی، منفعت طلبی کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔ ضرورت ہے کہ اس حقیقت کی طرف توجہ کیجئے کیونکہ معاشرہ کی زندگی اور اسکے مقررات پر عمل کرنے کیلئے ایسا قانون بہت ہی مؤثر ہوگا۔

قرآن کا ارشاد ہے: خدا سے بہتر کون حکومت کرنیوالا ہے (۱)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے، خدا ہمارے اجتماعی مناسبات کو معین کرنے والا اور ہمارے اعمال و رفتار پر حکومت کرنیوالا ہے اور وہ بہترین فرمانروا ہے (۲)

مکتب انبیاء کا ایک امتیاز یہ بھی ہوا ہے کہ ان کی تعلیمات میں اجتماعی مصالح، شخصی مصالح کی طرف پلٹتے ہیں۔ چونکہ اس نظریہ کے مطابق حیاتِ انسانی ختم ہونے والی نہیں ہے اس لئے شخصی مصالح ایک طولانی دور میں ـــ یعنی مرنے کے بعد ـــ بھی محفوظ رہتے ہیں۔

بشری قانون سازی میں ایک اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ افراد میں تربیت و علم و ادب کے لحاظ سے اختلاف ہوا کرتا ہے جو مختلف صنفوں میں موجود ہوتا ہے فیصلوں، صبر و تحمل، قومی طریقوں، مفاہیم و موجود واقعیات کے بارے میں اظہارِ نظر، اور بہت سے دوسرے مسائل میں مختلف تربیتی، فرہنگی، اجتماعی لحاظ سے اختلاف ہوتا ہے۔ بلکہ خود ایک معاشرہ کا زاویۂ نظر مسائل میں یکساں

۱۔ سورہ مائدہ آیت نمبر ۵۵۔ ۲۔ سورۂ اعراف آیت نمبر ۸۷

نہیں ہوتا۔ لغات وکلمات کے ایک سلسلے میں مفہوم تک الگ الگ سمجھے جاتے ہیں۔

آپ خود دیکھئے کہ صلح، عدالت، مساوات کے مفاہیم کس کس طرح بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کلمات کی تشخیص ہر فرد وگروہ کی اپنے اندیشہ وبینش کی وسعت کی مناسبت سے کیجاتی ہے۔ عام آدمی ان حقائق سے روشن وانسانی مفہوم سمجھے گا۔ لیکن حکام اور معاشرہ کے سربرآوردہ افراد ان کلمات و مسائل کو دوسری نظر سے دیکھیں گے۔

۵

یقیناً انسانوں کے اندر ماحول کی یہی تاثیر بشری قانون کے نامکمل اور ناقص ہونے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ قانون ساز شخصیتیں اپنے معاشرہ کے عقائد وافکار سے متاثر ہوکر اپنے ماحول سے جو کچھ سیکھتی ہیں انہیں کو مخصوص حقائق سمجھ کر اظہار کرتی ہیں۔ اور دانستہ یا نادانستہ طور پر قانون سازی کے وقت ان کے افکار کا محور انہیں اعتقادی وفکری سرمایہ اور میراث کیطرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور یہی چیز اور فرہنگ اجتماع کی مخصوص فضا حقیقت بینائی کی روح ان سے چھین لیتی ہے اور حقائق کو کما حقہ درک کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ انسان کے یہی آراء ونظریات مختلف حالات وشرائط کے پیش نظر مختلف ہوجاتے ہیں۔ واقعات وزندگی میں ترقی کے حالات کے وقت ان میں تغیر پیدا ہوجاتا ہے۔

جب آدمی کے ہاتھ میں زمامِ حکومت ہوتی ہے اور جب وہ ایک عام آدمی ہوتا ہے تو دونوں حالتوں کے فیصلوں میں اور نظریوں میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ دونوں حالتوں میں دو زاویہ سے دیکھتا ہے اور کبھی تو حالات

بدل جانے کے بعد اس کے نظریات کچھ اس طرح سے بدل جاتے ہیں جیسے گذشتہ حالات سے ان کا کوئی رابطہ ہی نہیں تھا اور آپ محسوس کریں گے کہ اس کے تمام نظریات یکدم سے بدل چکے ہیں اور یہ ایسی حقیقت ہے کہ تقریباً ہر شخص اپنی زندگی میں افراد کی زندگی میں جب نشیب و فراز آئے تو وہ خود دیکھ سکتا ہے۔

لیکن جہاں آسمانی قانون کی حکومت ہوتی ہے اور جہاں رسالت ایک نمائندۂ الٰہی کی حیثیت سے انسانوں کی مادی، روحانی، فکری اصل ضرورتوں کی جوابدہ ہوتی ہے اور فرد و اجتماع کی اصلاح کی ذمہ داری لیتی ہے وہاں حقیقت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور خدا کے سلسلے میں ماحول کا اثر، معاشرہ کے افکار سے تاثر، افکار کے بدلنے میں دیگر خصوصی اختلافات کی تاثیر کا کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واقعیات اور مصالح حقیقی تک رسائی کی وجہ سے جو عوامل انسان کے سلب اعتماد کا ذریعہ بنتے ہیں وہ یہاں مکمل طریقہ سے ختم ہیں۔

مکتب الٰہی کے اندر صرف "ایمان" (جو آدمی کے اوج فکری کا رمز ہے) ہی اجزائے قانون کا پشتیبان اور طاقتور ضامن ہے۔ اور یہ دوسرا امتیاز ہے۔

۳

جس معاشرے کی بنیاد انبیائے کرام رکھتے ہیں اس میں انسان کا کنٹرول خود انسان کے سپرد کر دیتے ہیں اور اسکی کوششوں اور اکتسابات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور انسان اگرچہ آزاد ہوتا ہے مگر خداوند عالم کے سامنے بڑی سختی سے جوابدہ بھی ہوتا ہے وہ جو بھی عمل کرے یا جس جگہ

کا انتخاب کرے اس کو پہلے سے اصول شریعت پر منطبق کرکے اس کے اجزا کی ضمانت اپنے ذمہ لیتا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ شریعت کی بنیاد پر عمل کرنا اپنے لئے اچھا انجام رکھتا ہے اور اگر اپنے فرائض سے منہ موڑتا ہے تو اس کو نقصان دہ اور برے انجام کا سامنا کرنا پڑیگا ___ قوانین الٰہی کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس شخص کی تمام ابعاد زندگی کو گھیر لیتا ہے اور یہی چیز سبب بنتی ہے کہ وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ ارادۂ الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔

مکتب الٰہی میں انسان کے تربیت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنی ہوس آلود خواہشات کی جگہ انسانی خواہشات اور مرضی الٰہی کو دیدیتا ہے تاکہ بندگی کے اعلیٰ ترین مقام پر پہونچ جائے اور زمین میں حق کی نمائندگی کی منزل تک رسائی حاصل کرے۔ ترقی یافتہ کامل انسان کا مطلب یہی ہے۔

بشری نظام میں چونکہ قانون سازوں کے پیش نظر ایمان کا مسئلہ نہیں ہوتا اس لئے قانون بھی جامع، اور نفوذ اور معنوی پشت پناہی سے بے بہرہ ہوا کرتا ہے۔ اور ہر شخص مقررات کے بوجھ سے اپنی پشت خالی کرنے کیلئے برابر راہ فرار اختیار کرنے کی سوچتا ہے اور اسی لئے اس قسم کے قوانین کو جاری کرنے کے لئے عمومی سطح پر طاقت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔

اور اگر کہیں قانون لوگوں کی خواہشات کے برخلاف ہے تب تو اجرا مزید مشکل تر اور پیچیدہ تر ہوجاتا ہے اور نفاذ قانون کے موقع پر غصہ، نفرت، کراہت، وفشار کے طوفان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ معاشرہ میں کچھ ایسے افراد ہوں جو بشری مقررات کے پابند اور اس کے علاقہ مند بھی ہوں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ایسے افراد بہت کم اور شاید استثنا کی صورت میں ہوں۔ عمومی صورت حال ہرگز یہ نہیں ہے

اور نہ بعنوان اصل اساسیٔ اجتماعی موردِ قبول واقع ہو سکتا ہے۔

اسلئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ امتیاز تعلیماتِ انبیاء کے آثار میں سے ہے اور صرف قانونِ آسمانی میں منحصر ہے۔ اور اگر لوگوں کی روح کا ایمانی غذا حق سے ہے اور مذہبی اعتقاد قانونی اصول کی پشت پناہی کرتا ہے تو وہ ایک عالمگیر جہانی عامل ہو سکتا ہے اور اس کی اجرا کی ضمانت بھی اس منزل تک ہوگی جہاں تک بشری قانون کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اس حد تک اپنے تحت تاثیر کرے۔

چونکہ وجود انسان کی ترکیبی کرداروں میں ایمان کی جڑیں پیوست ہیں اور بنیادی طور پر فرد کی شخصیت کی ساخت میں موثر ہیں اور نفسانی کیفیات کی گہرائی میں اتنی اثر انداز ہیں کہ انسان نہ صرف ذہنی و دماغی طور سے بلکہ اپنے تمام وجود کے ساتھ مذہب کا پابند اور معتقد ہو جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں ایسا یقین پیدا ہو جاتا ہے جو اعماق وجود کو روشن کر دیتا ہے۔

مذہب انسان کے وجود کے اندر ایک ایسی طاقت پیدا کر دیتا ہے جو کسی غیر مذہبی مکتب کے اندر نہیں پائی جاتی۔ تجربات شاہد ہیں کہ دیگر مکاتب اس سلسلہ میں ہمیشہ ناموفق رہے ہیں۔ کیونکہ مذہب کا انجام کار یہ ہوتا ہے کہ وہ دل پر اثر کرتا ہے اور دل کے اندر اعتقاد جتنا قوی ہوگا اسی حساب سے منشا عمل بھی ہوگا۔

آج کا انسان ان اداروں اور کمیٹیوں کی طرف سے یعنی وہ ادارے جو افرادِ بشر کے لئے نسلی، قومی، مذہبی، جغرافیائی اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے حقوق و قدر و قیمت کے قائل ہیں۔ پیش کئے جانے والے قوانین کی تدوین و تصویب کا خود شاہد ہے۔ اور اگرچہ آج کی علمی ترقی نے قبولِ واقعیات کے لئے مناسب ترین فکری زمین تیار کر دی ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ انہیں لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین سے استفادہ مکمل طور سے منفی ہے۔

اور نہ یہ قوانین قابل اعتبار ہیں نہ ان کا معاشرہ میں نفوذ ہے۔

جن چیزوں کو یہ لوگ خود قبول کرتے ہیں اس کے بھی پابند نہیں ہیں اور اگر کبھی یہ لوگ خود اس (قانون) کی زد میں آگئے اور ان کے منافع خطرے میں پڑ گئے اور انکی خواہشیں تشنۂ تکمیل رہ گئیں تو پھر یہ لوگ قانون شکنی، ضدِ انسانیت عمل کی انجام دہی فریب کاری، خراب کاری سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ اسی سے پتہ چل جاتا ہے کہ پھر دوسرے حضرات اس کو کیوں قبول کرنے لگے؟

بے سمجھے بوجھے انسانی قدر و قیمت کی اہمیت، قانون شکنی، وسیع پیمانے پر کشمکش، سیاسی جھگڑے، آپسی رقابتیں، طاقتور بڑی حکومتوں کی غیر انصاف پسندانہ اقتصادی مدد، معاشرتی طوفانوں کی شدت، اخلاقی مفاسد نے بشری قوانین کی متزلزل و لرزاں موقعیت کو مقام اجراء میں اس کے اعتبار و نفوذ کو اور اسکی حکومت کی محدودیت کو باقاعدہ واضح کر دیا ہے۔

اگر "جہانی حقوق بشر" اور "حقوق بشر" کے نشریات پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چل جائیگا کہ ان کا اثر و نفوذ صرف جشنوں کا انعقاد کر کے بے مقصد تقریروں اور خالی از حقیقت بیانات تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

اگر قدم بہ قدم لوگوں کے افکار کی گہرائی میں بدلتے ہوئے دینی خیالات کی تحقیق کی جائے تو بہت آسانی کے ساتھ پتہ چل جائے گا کہ غیر مذہبی اصول کی کمزوری و نا ہمہ گیری جس میں مفاہیم عالیہ کی گنجائش نہیں ہے بہت ہی عام بات ہے۔ اور اسی طرح مذہبی بنیاد کی اصالت و صداقت جس کی جڑوں میں خدائی تقدّس شامل ہے اور جس کا بہت گہرا اثر ہے اور جو اس آئیڈیالوجی اور فرہنگ کی تعیین کنندہ ہے جس میں مفکرین کی تحقیقات کے نتیجہ میں ہر روز بتدریج ترقی ہوتی جا رہی ہے اور جو تمام بشری فرہنگوں پر غالب ہے کیا ہم کو مذہب کی پابند نہیں بنا

ہے؛ ہم کو تاریخ پر نگاہ ڈالنی چاہیئے اور انسانی معاشرہ کے لئے جو زیادہ مفید ہو اور پر ثمر ہو اسکو اختیار کرنا چاہیئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کیا انسانی تکامل و سعادت کیلئے بنائے ہوئے بشری قوانین کی شکست و ریخت و ناکامی کا فلسفہ حقیقتِ انسانی کی جہالت کیوجہ سے نہیں ہے؟ اور انسان کی واقعی ضرورتوں سے غفلت اور اس کی خلاق طاقت و استعداد سے غفلت کی وجہ سے نہیں ہے۔

یہ تمام چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ مکتب انبیاء پر عقیدہ معاشرہ کی حیات کا ضامن اور لوگوں کے تمام صحیح روابط کو مضبوط بنانے والا، اور کمزور طبقوں کا محافظ، اور بشر کے لئے آزادی و برادری کا ہدیہ دینے والا ہے۔ اور جو بھی گروہ یا جماعت یا نظام اس روش کو اپنے سامنے نہ رکھے گا اور انبیاء کے حیات بخش پیام آزادی پر لبیک نہیں کہے گا وہ فلاح و رستگاری سے کبھی بھی ہمکنار نہیں ہو سکے گا۔

ایک مُستَنَد سَنَد

انبیاء کی رسالت میں سب سے پہلے انسان کی آزادی وخود مختاری کا مسئلہ وہ ہے جو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے ۔ اگر انسان اختیار و آزادی سے سرفراز نہ ہوتا تو ہمیشہ کے لئے رسولوں سے بھی بے نیاز ہوتا اور ایک جبری راستہ پر چلتا ہوا خود بخود ترقی کرتا ۔

لہٰذا بعثتِ انبیاء کے ساتھ لازمی طور سے ہم کو انسان کی آزادی بھی قبول کرنی پڑے گی ۔ اور اس کے علاوہ صورت میں سامنے بعثتِ انبیاء کا موضوع قابل بحث نہ ہوتا اور نہ ان کی اصل رسالت کی توجیہ کی جاسکتی ۔ رسالت سے مراد وہ واقعی رسالت ہے جو سوئے ہوئے انسانوں کو بیدار کردے اور انکو عناصرِ آگاہ و آزاد سے بدل دے ۔

قانونِ ہدایت وہ عام قانون ہے کہ جس کے زیر سایہ پوری کائناتِ ہستی ہو اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جب انسان میں غریزی رہنمائیاں ناکافی ہیں اور اسکی حرکت جبری نہیں ہے اور عقل کی فکری خود کفائی کی کمیاں کمال وسعادت کیطرف انسان کی رہبری کی نفی کرتی رہوں تو کسی طریقہ سے اس کمی کو دور اور خلا کو پر کرنا چاہیئے ۔

اسی لئے دستگاہ آفرینش و تکوین نے ناقابل تغیر مقصد تک رسائی کے لئے بشریت کے سامنے نبوت کا راستہ کھولا ۔ اور بشریت کے اختیار میں شناخت

و آگاہی کے لئے ایسے منابع و آلات دیے جس کے ذریعہ وہ قوانین ، مشخص رہنمائی روشن و خطا ناپذیر سعادت تک پہونچ سکتی ہے اور روز بروز بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور ہمیشگی کا جواب دے سکتی ہے ۔

ایک اساسی نکتہ اور مشہور مقولہ یہ ہے کہ دعویٰ بلا دلیل قبول خرد نہیں ۔ خصوصاً اگر کوئی بہت بڑا دعویٰ کرے تب تو اس کو قاطع اور اطمینان بخش دلیل اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرنا چاہیئے

اسی لئے جو لوگ توحید کو بطور عقیدہ قبول کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے دنیا کو دیکھتے ہیں جب ان کے سامنے کوئی شخص ادعائے نبوت کرے یا کسی کی نبوت کا مسئلہ درپیش ہو تو موضوع کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں بہت زیادہ غور و فکر کیا جائے ۔ اور بشریت کے رہنماؤں کے لئے جو شرائط و خصوصیات ضروری و لازم ہیں انکی باقاعدہ تحقیق و تفتیش کریں تاکہ سچے نبی کو پہچانا جا سکے ۔

چونکہ پیغام پیغمبری بہت ہی حساس موضوع ہے اور انسانی زندگی کی مختلف حالات میں ان کی عظیم مسئولیت ہے اسلئے انکو بھی اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کوئی مستند سند اور قطعی دلیل پیش کرنی چاہیئے ۔ اور وہ سند و دلیل ایسی ہو کہ جس کو خداوند عالم کے علاوہ اور کوئی نہ پیش کر سکے ۔

تاریخ گواہ ہے کہ انبیاء کی آمد کا مقصد اس انسان کو راہ نجات دکھانا تھا جو اندرونی طور پر کھو کھلا ہو چکا تھا اور انسان کی فطرت کے رشد و تفکر و دریافت میں جو موانع تھے اور جو خود انسان کی انسان سے بیگانگی کا سبب تھے ان کو دور بھی کرنا تھا تاکہ انسان اپنی گمشدہ چیز کو پالے اور قیام عدالت کے لئے اور مبنی بر انصاف معاشرہ کے وجود کے لئے اور ایک بلند و خوشگوار محیط کے لئے زمین ہموار ہو جائے ۔

اس قسم کے انقلاب کے لئے انبیاء کے اندر وسیع معنوی امکانات کا ہونا ضروری تھا اور اسی لئے ان کو سب سے پہلے اعجاز کے اسلحہ سے آراستہ کرکے بھیجا گیا تاکہ اپنی اسی طاقت کے ساتھ میدان میں آکر اپنی نبوت کا آغاز کریں۔

معجزہ ایک ایسا عمل ہے جس کو انبیائے کرام اپنے دعوائے نبوت کی سچائی کے ثبوت کے لئے مشیت و ارادۂ خداوندی کے ماتحت انجام دیا کرتے تھے تاکہ اس بات میں کوئی ابہام نہ رہ جائے کہ ان کا رابطہ منبعِ وحی اور آفریدگارِ ہستی سے ہے۔

کیونکہ جو شخص رسالتِ آسمانی اور رافتِ پیغام از طرف قدوسِ سبحانی کا مدعی ہے اس کو چاہیئے کہ ایسی بات پیش کرے جو فطرت و طبیعت کے چوکھٹے سے باہر ہو تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ یہ خدا کا فرستادہ ہے اور اسی وجہ سے اس کی گفتگو کا مطابق وحی ہونا قابلِ قبول ہوگا۔

کہیں لوگ جھوٹے مدعیانِ نبوت کے جال میں نہ پھنس جائیں اس لئے خداوندِ عالم نے اس روشن چراغ اور دلیل قاطع ـــــ یعنی معجزہ ـــــ کو صرف اپنے سفراء کے اختیار میں دیا ہے۔ تاکہ حقیقت و فریب کا پتہ چل جائے۔

جس طرح پیکرِ نظامِ ہستی اور ظواہرِ کائنات اثباتِ وجودِ خدا پر روشن دلیل اور توحیدِ ازلی کی نشانی ہیں اسی طرح معجزہ بھی پیغمبروں کے منبعِ وحی سے ارتباط پر واضح اور آشکار دلیل ہے وحی پر تکیہ کئے بغیر مذہب درست تفسیر نہیں حاصل کر سکتا اور مذہب کے تمام مسائل وحی سے ارتباط کئے بغیر بے مفہوم اور بے قدر و قیمت ہیں۔

برگزیدہ پیغمبر اپنے تمام جوش و خروش کے ساتھ لوگوں کو اپنے مقابلہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ وسیع و گہرے پیمانہ پر مقابلہ کے میدان میں آئے اور اپنی تمام طاقتوں

کواور امکانات کو بروئے کار لاکر لوگوں کے روبرو ہو۔ لیکن انسان اپنی تمام تر تلاش ہائے مذبوحانہ کے باوجود مقابلہ نہیں کر پاتا اور تھک ہار کر پیغمبر کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

کیونکہ معجزہ کا مطلب مبدا رجہان اور عالم وحی سے کھلا ہوا انتساب ہے۔ اور اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جہان ماورائے طبیعت سے غیر مرتبط انسان چاہے اپنی تمام طاقت و لیاقت کو صرف کر دے پھر بھی مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔

بنابراین اثباتِ نبوت کا راستہ ایسے کام کے انجام دینے میں منحصر ہوتا ہے جو نوامیسِ طبیعت اور عادی قوانین سے باہر ہوتا ہے۔ اور ایسے عمل کا تحقق اذنِ پروردگار کے بغیر ناممکن ہے۔ اور یہی معجزہ وہ مقیاس ہے جس سے حق و باطل کی شناخت ہو جاتی ہے۔

البتہ دیگر مظاہرِ کائنات سے اس کا تفاوت ہماری نظروں میں تو واضح ہے لیکن جو ذات ہستی کے تمام اسباب و علل پر آگاہی کامل رکھتی ہے اس کی نظر میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔

بہرطور معجزاتِ انبیاء ہمیشہ کلی اعتبار سے ان اہم کاموں کے مشابہ ہوتا ہے جو ہر زمانہ میں لوگوں کے افکار کو متوجہ کر لیتا ہے۔ تاکہ اس زمانہ کے ماہرینِ فن یہ بات سمجھ لیں کہ یہ کام حدودِ توانائی بشر سے خارج ہے۔ اور یہی نقطہ کارِ انبیاء کا آغاز ہے کہ افکار کے میزانِ رشد کو نظر میں رکھتے ہوئے لوگوں کے آسمانِ افکار کے وسیع افق کو تسخیر کر لیتے ہیں اور پھر بہت جلد اپنے بلند مقصد تک پہونچ جاتے ہیں۔

۵

جو لوگ معجزہ کو ایک محال اور ناقابلِ قبول چیز تصور کرتے ہیں وہ درحقیقت بہت ہی سطحی انداز اور سادہ لوحی سے سوچتے ہیں۔

دنیائے مادی میں جہاں بہت سے ایسے حوادث درپیش ہوتے ہیں کہ جن کی علت سے انسان آگاہ ہے۔ وہاں ایسے بھی حوادث رونما ہوتے ہیں کہ علوم طبیعی ان کی توجیہ و تفسیر سے عاجز ہے لہٰذا اپنی ناچیز معلومات پر بھروسہ کر کے مغرورانہ طور پر ہر اس واقعہ کا انکار نہیں کردینا چاہیئے جس سے ہم واقف نہ ہوں۔

انسان کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس کا خیال ہے کہ وہ ہمہ دان ہے لیکن جب کسی مسئلے کی گہرائی تک نہیں پہونچ پاتا تو فوراً اس کا انکار کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ ہمارے افکار ایک معین حد سے کسی بھی طرح تجاوز نہیں کر سکتے! انسانی شناخت کا دائرہ چاہے جتنا وسیع ہو جائے پھر بھی وہ ہر لحاظ سے محدود ہی ہوگا۔ اپنی محدود دانش و قوانین کو نامحدود ہستی تک پھیلانا عقلمندی کا کام نہیں ہے۔ ہمارے علمی وسائل اب بھی بہت سے مسائل کی تحقیق پر کافی قدرت نہیں رکھتے۔ علل و عوامل ہی تنہا وہ مسائل نہیں ہیں کہ جن کو ہم نے پہچانا ہے۔

انبیائے کرام کے معجزات نظامِ ہمہ گیر آفرینش کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتے۔ اور یہ ہماری کوتاہی ہے کہ اپنے محدود علم اور سرحدِ ماورائے طبیعت میں ہماری فکری ناکامی ہم کو نئی اور ناآشنا زمینوں تک پہونچنے نہیں دیتی۔

زمان و مکان کے اعتبار سے ہستی پایان ناپذیر ہے اور جتنا حصہ انسان کے زیر مطالعہ ہے۔ وہ کسی بھی طرح تمام کائنات کے افکار کو انسان کے اندر وجود نہیں بخش سکتا ـــــ یعنی بہت سی چیزوں کا جواب ہمارے لئے ناممکن ہے ـــــ تو اگر انبیائے کرام کے معجزات کے طبیعی علتوں کی تشخیص کے بارے میں ہمارے سوالات کے جوابات ممکن نہ ہو سکیں تو آخر اس میں کون سی عیب کی بات ہے؟

معجزات کا قیاس ریاضت کشوں ـــــ سادھوؤں و جوگیوں وغیرہ ـــــ کے کرشموں سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ کرشمے فکری و فطری مسائل اور تعلیم و مشق

وتمرین کے دائرے سے باہر نہیں ہیں کہ جن کا خواہ مخواہ ایک لازمی نتیجہ ہو۔ اور یہ کرشمے ان دیگر افراد سے بھی ظاہر ہو سکتے ہیں جو اسی فن میں ہوں اور مشق وتمرین کریں اور چونکہ یہ کرشمے محدود انسانی طاقت کا نتیجہ ہوتے ہیں لہٰذا ہر شرائط کے ساتھ اور ہر وسیلے سے ان کا انجام دینا ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح بہت سی جگہوں پر ان لوگوں کی حرکات وفعالیت بے مقصد ہوتی ہے جس کا انسانی زندگی پر کوئی مثبت اثر نہیں پڑتا۔ اور کوئی بھی شخص ان کے کرشموں کو معجزہ یا ارتباط با خدا کی علامت نہیں سمجھتا۔

۵

اسی طرح نابغہ دہر حضرات جو کارنمایاں کرتے ہیں وہ بھی ایک پیچیدہ ودقیق علمی اسرار کے ایک سلسلے سے آگاہی اور ذہنی محاسبات اور خرد وفکر کی طاقتوں سے بہرہ برداری کے نتائج ہوتے ہیں۔ ان کا معجزہ سے کسی بھی قسم کا رابطہ نہیں ہوتا۔ بلکہ جو شخص بھی اس علم کے مقدمات کو سیکھ کر اس میں مہارت حاصل کرلے وہ بھی یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ ان امور کی انجام دہی تعلیم وتربیت پر موقوف ہے۔ اسی طرح یہ چیزیں صرف مخصوص مقامات پر انجام دی جاسکتی ہیں اور معارضے کے لائق ہیں۔ لیکن معجزہ وحی سے مربوط اور غیر محدود الٰہی طاقت کے بل بوتے پر انجام پاتا ہے۔ نہ یہ تعلیم وتربیت سے ہوسکتا ہے نہ کسی نگرانی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

آخر بغیر کسی مربی یا معلم کے گہوارہ ہی کے اندر حضرت عیسیٰ نے گفتگو فرمائی کہ نہیں؟ یہ معجزہ کہلاتا ہے۔

امام جعفر صادق (ع) فرماتے ہیں: خداوند عالم نے پیغمبروں کو ایسے معجزات عطا فرمائے تاکہ یہ معجزات ان کی صداقت وسچائی پر واضح براہان بن سکیں

اور یہ برہان خدا اپنے منتخب کردہ بندوں اور اپنی معین کردہ حجتوں کے علاوہ کسی کو عطا نہیں کرتا۔ تاکہ مدعی خدا سے اپنے ارتباط کو باقاعدہ ثابت کر سکے۔ اور فریب کاروں کا پردہ چاک کیا جا سکے۔

یہی وجہ ہے "عمل خارق عادت" معجزہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور میدان مقابلہ میں اپنی پرانی طاقت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا اور یقیناً شکست کھا جائے گا۔

خاص توجہ دینا چاہیئے کہ معجزہ قانون علیت کا ناقض نہیں ہے اور نہ ہی سنت آفرینش کو تبدیل و شکست دیتا ہے۔ جس خدا نے نظام کائنات کے اندر علل و معلولات کا ایک سلسلہ ایجاد کیا ہے وہ ان علتوں کے قید و بند میں خود کبھی گرفتار نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے لئے کوئی مانع نہیں ہے کہ بطور استثناء اس عادی نظام کے اندر وقتی تغیر کر دے کیونکہ وہ اس پوری کائنات پر قاہر و مسلط ہے۔ اور یہ وقتی تغیر ایک سلسلۂ علل کے اوپر موقوف ہے کہ آج کا ترقی یافتہ علم اس کی (چگونگی) کی تفسیر سے عاجز ہے۔ بلکہ وہ سلسلہ نوابغ دانشمندان پر بھی مجہول ہے اور بشر کی محدودیت شناخت و وسائل کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جو علتیں ارادۂ الٰہی کے کنٹرول میں ہیں۔ بشر ان پر کبھی بھی دسترسی حاصل نہیں کر سکتا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ "سنن ناشناختہ" کو قانون علیت کے دائرہ سے باہر بھی فرض نہیں کیا جا سکتا۔

۵

یہ عرض کیا جا چکا کہ انبیاء کے معجزات ایک ماورائے طبیعت کے رابطہ کی حکایت کرتے ہیں۔ اور تجلی نور توحید سے ناشی ہوتے ہیں۔ اور یہ معجزات اس "ارادۂ الٰہی کے" کہ جس نے تمام ظواہر کائنات کو پیدا کیا اور ان پر نظام عمومی کیساتھ قانون استثناء کو بھی حاکم بنایا" جزئیات میں سے ایک جزئی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہم خود بھی اپنی دنیا کے اندر اس سنن استثنائی کے نمونے موجود پاتے ہیں۔ مثلاً اس سردی کے زمانہ میں جب برف جم رہی ہو اور تمام نباتات اپنی سبزی و شادابی کو کھو بیٹھے ہوں درخت کاج (۱) و شمشاد اسی طرح سرسبز و شاداب رہتے ہیں جیسے پہلے تھے۔

کیا یہ دو قسم کے درخت تمام درختوں کے وضع عمومی سے مستثنیٰ اور درختوں کے عمومی قانون کو توڑنے والے نہیں ہیں؟

یقیناً ایک رشتۂ عوامل اور دیگر علل اس میں ایسے موجود ہیں جو درختوں کے سنن کلی سے مغایرت رکھتے ہیں۔

ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو تحقیق و تجربہ سے یہ ثابت کر دے کہ حوادث کے لئے اب تک جو علل و عوامل دریافت کئے گئے ہیں وہی جاودانی اور دائمی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر اسباب و علل سے حوادث کا تحقق ناممکن ہے۔

فرانس کے مشہور محقق ڈاکٹر کارل اپنی شہرۂ آفاق کتاب "انسان موجود ناشناختہ" میں تحریر کرتے ہیں:

اماکن مقدسہ اور زیارت گاہوں میں بیماریوں سے جلد شفایاب ہونے کے لئے اور علاج کے لئے کم و بیش ہر شہر اور ہر زمانہ میں لوگ معجزہ کے قائل رہے ہیں لیکن آجکل یہ عقیدہ کمزور ہو گیا ہے اور اطباء کا ایک گروہ معجزہ کے وجود کا قائل نہیں ہے۔۔۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے مشاہدات بہرحال غور و فکر و تامل و تحقیق کے لائق ہیں۔

حکیموں کے ادارہ (لورڈ) نے اس قسم کے بہت سے مشاہدات کو جمع کر لیا ہے

۱۔ صنوبر کی ایک قسم ہے۔

اب تک کے ہمارے معلومات یہ ہیں کہ شفا کے امراض میں دعا کی فوری تاثیر "ہڈیوں
کے سِل ۔ جلد کے سِل کے مریض ۔ پیپ آلود زخموں کے مریض ، سرطان کے
مریض حضرات نے اپنے تجربات دیے ہیں   ان سب سے معجزہ کی
تصدیق ہوتی ہے ـــــ رہا علاج کے (چگونگی) کا معاملہ تو دونوں گروہوں میں
زیادہ فرق نہیں ہے ۔ زیادہ تر شدید درد ختم ہو جاتا ہے اور کامل شفا حاصل
ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح چند سیکنڈ یا چند منٹ یا زیادہ سے زیادہ چند
ساعت کے اندر زخموں میں جوش پیدا ہوتا ہے ۔ اور بیماری کی علامتیں ختم
ہو جاتی ہیں ۔ مریض کی بھوک دوبارہ واپس آجاتی ہے ۔

مشرکین کی بے تکی باتوں کا جواب

یقیناً ضرورت سے زیادہ خود پرستی، تجاہل، واقعیات کے بہ نسبت کج فکری انسان کی گمراہی، انحراف اور اس کے اندیشہ و افکار پر خواہشات ہوس آلود کے تسلط کا سبب بنتاہے۔ اور حقیقت پسندی اور راہِ حق و حقیقت میں تا طمانہ قدم رکھنا اندرونی بلاحت آمیز کشش سے خالی ہونے کو مستلزم ہے۔ حقیقت کی جستجو کرنا ہر انسان کا خاص وظیفہ ہے اور حقیقت تک رسائی تنہا راہِ نجات ہے۔

انبیاء سے ایسے معجزات کا مطالبہ کرنا جو ان کے دعویٰ کی صداقت کے گواہ ہیں۔ اس بات کو قرآن نے منطقی مطالبہ تسلیم کیا ہے اور لوگوں کی درخواست اور انبیاء کے مثبت اقدام کی تفصیل بھی نقل کرتاہے البتہ اس زمانہ میں بھی کچھ لجوج و بے منطق افراد ایسے تھے جو عملاً حق کے قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ انبیاء کرام سے من مانی معجزے کی درخواست کرتے رہتے تھے بلکہ بسا اوقات تو ایسے اعمال کا مطالبہ کرنے لگتے تھے جو عقلاً نا ممکن ہے۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ انبیاء ان کے بچکانہ اور لجوجانہ مطالبات کو مانتے بھی نہیں تھے۔

کیونکہ معجزہ کا مطلب رسالت کی گواہی ہوا کرتاہے۔ اور یہ چیز ہر اس معجزے کے تکمیل کی تائید کرتی ہے جس سے رسالتِ الٰہی کو اطمینان ہوسکے۔

اور یہ کہاں سے ضروری ہوگیاہے کہ انبیاء ہر شخص کی خواہش کے مطابق معجزات کا اظہار کرتے رہیں؟ اور کیا معجزات کو ہر ہوسبازو بے مقصد انسان کے

ارادہ کے تابع ہونا چاہیئے ؟
انبیاء برابر اس بات کا اعلان کرتے رہتے تھے کہ ہم مخلوق کی ارشاد و ہدایت کیلئے مامور ہیں اور معجزات کا اظہار خداوند عالم کے ارادہ اور موجودہ حالات کے ضرورت کے وقت ہی کیا جاتا ہے نہ یہ کہ جو مکار و عیاش قسم کے لوگ چاہیں اس کے مطابق اظہار معجزہ کیا جائے ۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے : خدا کی اجازت کے بغیر کسی رسول کو اظہار معجزہ کا حق نہیں ہے ۔ (۱)

خدا اگر چاہے تو تمام لوگوں کو معجزہ کی طرف متوجہ کرسکتا ہے مثلاً جمادات و نباتات میں قوت گویائی پیدا کردے یا اسی قسم کے دوسرے حیرت انگیز افعال پر مجبور کردے تاکہ لوگ خود بخود دین خدا کی حقانیت کی تائید کرنے لگتے ــــ لیکن یہ طریقہ انسان کے رشد و انتخاب آگاہانہ و جہت آزادی کے لئے مناسب نہیں تھا اور خدا اس قسم کا عمل نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جبری طور سے نہیں بلکہ اختیاری طور سے غور و فکر کرکے خدا کی توحید اور اس کے رسولوں کی شناخت کریں ۔

جو لوگ حق سے روگردانی کرتے ہیں وہ فطری طور پر اپنے عمل ورد عمل کا نتیجہ دیکھیں گے ۔ کیونکہ اس دنیا میں ہر چیز کامل ہم آہنگی سے آگے بڑھتی ہے ۔ اور اگر خدا یہ طے کرلیتا کہ افراد بشر کی ہر تباہ کاری کی سزا فوری طور پر دے گا تو اس کا برداشت کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی ۔

اگر مخالف حضرات کا نظریہ صرف انکشاف حقیقت ہوتا تو جامع اور وسیع تحقیقات

۱۔ سورہ مومن آیت نمبر ۷۸

اور واضح معجزات کو دیکھ کر فوراً حق قبول کر لیتے ۔ لیکن ان کے تقاضوں کی کیفیت، انکی بدنیتی اور بے جا اعتراض پر خود ہی دلالت کرتی ہے ۔ ان دشمنوں کا مقصد ہی انبیاء کی تکذیب اور حق سے روگردانی کرنا تھا ورنہ واضح معجزات کی موجودگی میں تکرار کی ضرورت ہی نہیں تھی اور اگر تکرار بھی ہوتی جب بھی یہ ایمان نہ لاتے ۔

قرآن کا ارشاد ہے : جب ہماری بارگاہ سے حق انکی طرف بھیجا گیا تو کہنے لگے جیسے معجزے موسیٰ کو عطا ہوئے تھے ویسے ہی اس رسول (محمدؐ) کو کیوں نہیں دیئے گئے ۔ کیا جو معجزے اس سے پہلے موسیٰ کو دیئے گئے ان سے ان لوگوں نے انکار نہیں کیا تھا ؟ (۱)

بلکہ ان لوگوں کی بہت سی درخواستیں تو شرائطِ معجزہ کے مطابق ہی نہیں ہوتی تھیں چنانچہ قرآن کا اعلان ہے یہ لوگ رسولِ خدا سے کہا کرتے تھے : اپنی رسالت کی تصدیق کے لئے خدا اور فرشتوں کو ہمارے پاس لائیے ۔ (۲) اور دوسری آیت میں اسی قسم کے بے ہودہ نامعقول اعتراضات کا تذکرہ ہے چنانچہ ارشاد ہے : (اے رسول کفارِ مکہ نے) تم سے کہا کہ جب تک تم ہمارے واسطے زمین سے چشمہ (نہ) بہا نکالو گے ہم تم پر ہرگز ایمان نہ لائینگے یا (یہ نہیں تو) کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اس میں تم بیچ بیچ میں نہریں جاری کر کے دکھا دو یا (جیسا تم گمان رکھتے تھے) ہم پر آسمان ہی کو ٹکڑے (ٹکڑے) کر کے گراؤ یا خدا اور فرشتوں کو (اپنے قول کی تصدیق میں ہمارے سامنے) گواہی میں لاکھڑا کر دو یا تمہارے (رہنے کے) لئے کوئی طلائی محل سرا ہو یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور جب تک تم ہم پر (خدا کے یہاں سے) کتاب نہ نازل کرو گے کہ ہم اسے خود پڑھ بھی لیں اس وقت تک ہم تمہارے

۱۔ سورہ قصص ۔ آیت نمبر ۴۸ ۲۔ سورہ فرقان ۔ آیت نمبر ۲۱

(آسمان پر) چڑھنے کے بھی قائل نہ ہوں گے (اے رسول) تم کہدو کہ سبحان اللہ میں ایک آدمی (خدا کے) رسول کے سوا آخر اور کیا ہوں؟ (جو یہ بیہودہ باتیں کرتے ہو) (۱)

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اعتراض کرنے والے رسول خدا ؐ سے چاہتے تھے کہ خدا کے برگزیدہ بندہ ہونے اور مبداء ہستی سے ارتباطِ خاص کے دعویٰ کے ثبوت میں معجزہ دکھائیں کہ زمین میں چشمہ جوش مارنے لگے یا میووں سے لدا ہوا باغ، یا سونے کا مکان (فوری طور پر) ہو جائے کیونکہ یہی چیزیں اس زمانہ کے شرفا کی علامتیں تھیں۔

اگرچہ کافروں کی یہ درخواستیں قابل قبول تھیں اور بعض لوگ ان میں سے بعض کے اسباب کے مالک بھی ہو سکتے تھے مگر یہ لوگ نبی نہیں تھے۔ دراصل ان مادی امکانات کا رکھنا اعجاز ورسالت کی دلیل نہیں ہے اور سندِ نبوت کے عنوان پر کسی سے یہ باتیں قابل قبول بھی نہیں ہیں۔ البتہ ان کی خواہشات سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ کس حد تک کوتاہ بین اور ابتذال پسند تھے کہ ثروت مال اور اقتدار کو دلیل رہبری خیال کرتے تھے۔

ان لوگوں کی دوسری خواہش اس قسم کی تھی جس قسم کی خواہش مرتاض و ریاضت کش حضرات سے کی جاتی ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ آسمان سے عذاب الٰہی نازل ہو اور لوگوں کا رشتۂ حیات قطع ہو جائے ــــ حالانکہ معجزہ کا مقصد انسانوں کی رشد وہدایت، تنومند پرورش، حریتِ فکر تمام وابستگیوں سے آزادی اور حق قبول کرکے نئے نظام فکری کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہوتا ہے ــــ

۱۔ سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۸۹ تا ۹۳

اور خدا و فرشتوں کا اترنا اس لئے ناممکن ہے کہ خدا نہ جسم ہے نہ زمان و مکان کے ساتھ محدود ہے اس لئے نہ مادی مظہر بن سکتا ہے نہ مادہ کی صورت میں نمودار ہو سکتا ہے اس قسم کے مطالبات محض بچکانہ اور غیر منطقی تھے آخر میں خدا ان بے جا معجزہ طلب کرنے والوں کو اسطرح جواب دیتا ہے : اے رسول ﷺ کہد یجئے میرا خدا ان باتوں سے منزہ ہے اور میں ایک پیغامبر سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ کا تعلق ذات الٰہی سے ہوتا ہے اور نبی ارادۂ خدا کی پیروی کرتا ہے اور خدا کی اجازت کے بغیر جہانِ تکوینی میں حق تصرف نہیں رکھتا اور ہر درخواست پر اظہار معجزہ نہیں کر سکتا۔

ان لوگوں کا ایک اعتراض انبیاء کا جنس بشر سے ہونے پر تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انبیاء کو معاشرہ کی فرد نہ ہونا چاہیئے اور نہ لوگوں کے درمیان سے مبعوث ہونا چاہیئے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے ان کی شرک آلود و محدود عقل ـــــ جو مفہوم بعثت کے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے ـــــ کو محکوم کرتا ہے اور انکے خیالات کو باطل قرار دیتا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب تو اس پر ہے کہ یہ لوگ کہتے تھے : جب تک ہم کو خود ایسی چیز (وحی وغیرہ) نہ دیجائیگی جو پیغمبرانِ خدا کو دی گئی ہے اس وقت تک تو ہم ایمان نہ لائیں گے ـــــــــ جو لوگ ایمان لانے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں اور اپنی جاہلانہ فکروں سے آزادی کی طرف مائل نہیں ہیں اور نہ صراط مستقیم تک پہونچنے کے لئے راضی ہیں ان کے لئے معجزات کی تکرار کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اور جو لوگ منکرِ وحی ہیں وہ مسئلہ وحی اور تعلیمات انبیاء کی اسطرح توجیہ کرتے ہیں کہ ان حضرات کی تعلیمات آسمانی نہیں تھیں بلکہ وہ پاک نہاد و برجستہ ترین

اور نبوغ فکری کے مالک افراد تھے اور چونکہ انبیاء کے زمانہ کے لوگ عقل کی باتوں کو نہیں مانتے تھے اسی لئے ان کی اطاعت حاصل کرنے کی خاطر معاشرہ کی اصلاح کے لئے اپنی طرف سے اور اپنی نظریں جو مفید مقررات وقوانین بناتے تھے ۔ان کی نسبت خدا کی طرف دیدیا کرتے تھے ۔

یہ بات نہ تو منطقی ہے اور نہ حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ انسان چاہے جتنی استعداد کا مالک ہو اور نبوغ ذاتی رکھتا ہو اگر اس کی تعلیم وتربیت نہ کی گئی تو ساری استعداد دفن ہو جاتی ہے ۔ اور اس کا نبوغ ہرگز کسی منزل تک نہیں پہونچتا۔

لیکن انبیاء کی دانش آموزی کسبی نہیں تھی اور نہ ان حضرات نے اپنے زمانہ کے اساتذۂ فن سے استفادہ کیا تھا ۔ بلکہ انکو جو کچھ بھی ملتا تھا وہ خدا کیطرف سے تھا اس کے علاوہ تمام نوابغ کے کارنامے مادی وطبعی اصول کے مطابق ہوتے ہیں ــــ لیکن انبیاء کے معجزات مادی وطبعی فارمولوں اور قوانین کے مطابق نہیں ہوا کرتے ۔

اور اگر ہوش تیز بین اور نبوغ کے علاوہ انبیاء کے پاس دوسرا کوئی سرچشمہ نہیں تھا اور نہ کسی تازہ عالم تک ان کی رسائی ہوئی تھی تو نبوت کے بعد جو تعلیمات ان حضرات نے پیش کی ہیں ان کی پہلے سے کوئی مثال و نظیر موجود ہوتی نیز یہ حضرات اپنی فکری مسائل کو تھوڑا تھوڑا کر کے پیش کرتے نہ کہ دفعتاً ایک ہی مرتبہ میں ساری تعلیمات پیش کر دیتے ۔

حالانکہ بغیر کسی استثناء کے ان حضرات کے تمام عمیق انقلابات آغاز بعثت سے ہی شروع ہو جاتے تھے اور اعلان نبوت سے پہلے انکی معنویت و پاکیزگی سے قطع نظر کرتے ہوئے مکمل طور پر ان کے حالات عام اور عادی افراد جیسے ہوتے تھے ۔

ایک بارگی تحول اور ناگہانی طور پر ایسی تعلیمات کا پیش کر دینا جو انسان کے تمام اعمال و افکار کو ایک جامع عملی و فکری نظام میں منتقل کر کے معین و مشخص مقصد کی طرف متوجہ کر دیتا ہے ___ یعنی انسان کو مادی اور اجتماعی طاقتوں سے آزاد کر دیتا ہے اور خدا کیطرف پلٹا دیتا ہے ___ یہ خود شاہد بیّن ہے اور ثابت کرتا ہے کہ ان کے لئے کوئی جدید عامل در پیش ہوا ہے اور انکشافِ حقیقت کے لئے کوئی نیا چشمہ انکے اختیار میں دیدیا گیا ہے۔

تاریخ بشر کے صفحات میں ہرگز ایسے افراد کا وجود نہیں ملتا جن کے نبوغ کا ثمرہ اور استعداد کا نتیجہ دفعتاً جست کر کے سامنے آگیا ہو ___ حالانکہ انبیائے الٰہی میں مکمل طور سے یہی کیفیت رہی ہے۔

اگر کوئی بے تعصب محقق "تاریخِ زندگانی انبیاء" پر صرف تھوڑی سی تحقیق پر کفایت کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ ان حضرات کی پوری زندگی صدق و راستی حق پرستی اور انسان دوستی پر مشتمل رہی ہے اور انکی امیدوں کی تکمیل کے راستے میں کیسے کیسے پرشکوہ ایثار، تحمل و برداشت ریزہ ریزہ کر دینے والے مشکلات خاص طور سے پیش آتے رہے ہیں یہاں تک کہ کینہ توز دشمن کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ واقعاً یہ صرف یہی حضرات کر سکتے تھے۔

اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن سے واقعی طور پر انبیاء کی "انسان دوستی" اور حق طلبی کی قدر و منزلت اور ان ناپسندیدہ عناصر کے ناچگاہوں کے مقابلہ میں قیام کرنا جو ہمیشہ مردانِ خدا سے برسرِ پیکار رہا کرتے ہیں؟ کا پتہ چلتا ہے۔

اس حساب سے محض معاشرہ میں اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے ان حضرات کی طرف جو کجیوں اور سرکشیوں اور انحرافات سے علیحدگی کے کامل نمونے ہیں کیونکر خلافِ واقع بات کی نسبت دی جا سکتی ہے؟

کیا یہ مناسب ہے کہ جن اشخاص کے رفتار میں کسی قسم کی بھی خود خواہی نہ دکھائی دیتی ہو انکو گزاف گوئی اور بے بنیاد باتوں سے متہم کریں ؟ نہ صرف یہ کہ ان کی رفتار ارزندہ نظام جاہلیت کے گرداب میں غوطہ لگانے والے افراد بیشتر کو جلد از جلد اس سے نکالنے کی کوشش کرتی تھی بلکہ تعلیماتی لحاظ سے بھی ان مردانِ حق کا مکتب لوگوں کو صداقت و راستی کی دعوت اور ریاکاری و منافقت سے نفرت دلاتا تھا۔

حضرت علی ؑ اپنی ایک گفتگو میں حالاتِ انبیاء کی تشریح کرتے ہوتے فرماتے ہیں کہ یہ حضرات انسانی فضائل کے اعلیٰ ترین نمونے تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

میں موسیٰ کلیم اللہ کے بارے میں کیا کہوں خدا کی قسم جب بارگاہِ احدیت میں دستِ دعا بلند کر کے اپنے خدا سے مال کا سوال کرتے تھے تو صرف ایک ٹکڑا روٹی جس سے رفع گرسنگی ہو سکے اور کسی چیز کا سوال نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اپنی تہی دستی کی وجہ سے علفہائے بیابانی سے اپنی بھوک مٹا لیتے تھے۔ شدت لاغری کا یہ عالم تھا کہ پیٹ کی نازک کھال سے گیاہ کی سبزی نمودار ہوتی تھی۔

جناب داؤد کہ جو مزامیر لانے والے تھے ان کا کیا ذکر کروں لیفِ خرما سے زنبیل (باسکٹ) بنایا کرتے تھے اور اپنے دوستوں سے کہتے تھے تم میں سے اس زنبیل کو کون خریدے گا۔ اس کی قیمت سے جو کی روٹیاں خرید کر کھایا کرتے تھے

جناب عیسیٰ کے بارے میں کیا عرض کروں۔ سوتے وقت ایک پتھر کے ٹکڑے کو سرہانے رکھ لیا کرتے تھے۔ ہمیشہ سخت لباس پہنتے تھے۔ بھوک کے عالم میں دن بسر کرتے تھے تاریک راتوں میں چراغ چاند کی روشنی ہوتی تھی اور نیلگوں آسمان کی چھت سردیوں میں انکی پناہ ہوتی تھی۔ زمین سے اگنے والی گھاس انکی خوراک ہوتی تھی۔ انکے بیوی نہیں تھی جس سے ان کے افکار میں کوئی

خلل پڑتا ہو۔ نہ کوئی اولاد تھی جس کی نگرانی میں اپنا قیمتی وقت صرف کرتے۔ مال و دولت نہیں تھی جو ان کی توجہ کو بٹاتی۔ نہ حرص و آرزو تھی کہ ثروت اندوزی کی وجہ سے ذلتِ نفس کا شکار ہوتے۔ دو نوں پیر آپ کے لئے سواری کا جانور تھے اور دونوں ہاتھ خدمت خلق کے لئے کھلے رہتے تھے۔

(مسلمانو) اپنے اس نبی کی پیروی کرو جو عالیقدر پیشوا، فضائلِ انسانی کے کامل نمونہ تھے۔ خدا اسی شخص کو دوست رکھتا ہے جو اپنی زندگی میں اپنے نبی کی پیروی کرے اور ان کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرے راہ و رسم زندگی بسر کرنے میں ان کا اتباع کرے کہ جنہوں نے اس دنیا سے بہت ہی کم فائدہ اٹھایا۔

خشک روٹی آپ کی غذا تھی اور وہ بھی صرف آدھا پیٹ کھایا کرتے تھے آپ کے سامنے دنیا کو پیش کیا گیا لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا۔ خدا کو جو چیزیں ناپسند تھیں آپ ان سے نفرت کرتے تھے۔ اور خدا جن چیزوں کو پست و ذلیل سمجھتا ہے اسکو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

حضورؐ کھانا کھاتے وقت زمین پر بیٹھتے تھے۔ غلاموں کی طرح نشست و برخاست فرماتے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے اپنی جوتیوں کو بذات خود ٹانکتے تھے۔ ایک سادہ سا پردہ آپ کے دروازہ پر پڑا رہا کرتا تھا۔ جس کے لئے اپنی بیوی سے فرماتے تھے اسکو میرے سامنے سے ہٹا دو کیونکہ جب اس پر میری نظر پڑتی ہے تو مجھ کو دنیا اور اس کے تجملات یاد آنے لگتے ہیں۔

آپؐ دل سے دنیا پرستی سے گریزاں تھے۔ یادِ دنیا کو اپنے دل سے بھلا دینے کی کوشش فرماتے تھے آپ نے اپنے ضمیر و باطن سے دنیا داری کو ختم کر دیا تھا۔ زینتِ دنیا سے آنکھ بند کر لی تھی۔

ہر عقلمند کو فیصلہ کرنا چاہیئے اور اپنے دل سے پوچھنا چاہیئے کہ خدا حضرت محمدؐ کو اس طرح کی زندگی کے ساتھ پسند کرتا تھا کہ نہیں یا ذلیل و رسوا سمجھتا تھا؟ اگر کوئی کہے کہ خدا ان کو ذلیل سمجھتا تھا تو اس نے خدا پر اتہام لگایا اور ایک بیہودہ سی بات کہی ہے۔

لہٰذا تم لوگ محمدؐ کی پیروی کرو کیونکہ وہی پرچم دار قیامت اور سب کے اعمال کے شاخص ہیں۔ آپ نے عقل و ہوشمندی کے ساتھ دنیا میں قدم رکھا اور بڑی ہی سلامتی کے ساتھ گزر بسر کی یہاں تک کہ خدا کی دعوت پر دنیا سے رخت سفر باندھا۔ اپنے رہنے کے لئے پتھر پر پتھر نہ رکھا یعنی کوئی عمارت تک نہ بنوائی اور نہ کوئی شاندار محل تعمیر کیا۔

ہم خدا کا جتنا بھی شکر ادا کریں وہ کم ہے کہ اس نے اپنے لطف و عنایت کی وجہ سے محمدؐ جیسے رسول کو ہماری طرف بھیجا۔ تاکہ ان کی اقتدا کریں اور انکے پیرو ہو جائیں اور انکی زندگی کا طریقہ اپنائیں۔(۱)

انبیا کے شناخت کا طریقہ صرف معجزہ میں منحصر نہیں ہے بلکہ عصرِ رشد و خرد اور تکاملِ دانش کے دور میں علمی و عقلی روش بھی نبوت کی عمیق ترین راہ تشخیص ہے۔ اور اس ذریعہ سے فردی و اجتماعی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور دقیق تحقیق اور بے لاگ جستجو سے سچے رسولؐ کو پہچانا جا سکتا ہے اور تحقیق کا راستہ ایسا طریقہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے معجزات دیکھا ہے اس سے زیادہ عمیق تر طریقہ سے آسمانی رسالت کا انکشاف کیا جا سکتا ہے۔

علمی اداروں اور تحقیق پسند حضرات کے لئے صرف مکتب بر اعجاز کے مقابلہ

۱۔ نہج البلاغہ۔ محمد عبدہ صفحہ ۳۵-۱۶

میں اپنے کو موثر تر طریقہ سے متعارف کرا سکتا ہے اور اپنے اصلی پروگرام کی جلوہ نمائی
کر سکتا ہے۔

سب سے زیادہ روشن و مستند ظہور دانش و تجلی علم کے دور میں وہ سچا مکتب ہے جو علمی پیمانوں اور نظام ہستی کے واقعیات سے مکمل طور پر موافق ہو۔
اس لئے دیکھنا چاہئیے کہ اگر کوئی مکتب علمی موازین پر پورا نہیں اترتا اور مقررات و محتوی کے لحاظ سے حریت فکر و علم سے متضاد ہے تو بے تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس مکتب کا رابطہ آفریدگار سے نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرہ کے رشد فکری اور علمی پیشرفت کے ساتھ ساتھ انبیاء کی اصلی اور تکامل آفرین تعلیمات ___ جو معنوی اور مادی ضرورتوں کی ضامن ہیں اور فرد و معاشرہ کے رشد و بلندی کا سبب ہیں ۔ ___ موہومات و خرافات کی تاریکیوں سے چمکتی ہیں اور اپنے تابناک چہرہ کی نشاندہی کرتی ہیں ۔

شناختِ وحی

نظامِ ہستی کے اندر ایک دقیق و پیچیدہ اور انبیاء و خدا کے درمیان مخصوص رابطہ (وحی) ہے۔ جو تنہا نبوتِ آسمانی کی شناخت کا منبع اور انبیاء کے اصلی علوم و معارف کا ستون ہے۔ اور یہ جوامع بشری میں تحولِ مثبت و عمیق اور رسالتِ عظیم کی حامل ہے۔

انبیائے کرام حقائقِ ہستی کی اسی برتر و روشن آگاہی ــ یعنی وحی ــ کے ذریعہ احکامِ الٰہی و تعلیمات و قوانینِ آسمانی کو جہانِ ملکوت سے لے کر غیبی پیام کے عنوان سے لوگوں تک پہونچاتے ہیں۔

یہ حضرات گمراہیوں، بے انصافیوں، اختلافات کے اوجِ کمال پر پہونچنے کے بعد تاریکیوں کا سینہ چاک کر کے ظاہر ہوتے ہیں اور اپنے انقلاب کو فرمانِ وحی کے مطابق آغاز کرتے ہیں اور ایک اصیل جنبشِ فکری کے زیر سایہ انسانوں کو اپنی لطیف فطرت کے ادراکات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ماحول سے حاصل کی ہوئی بری عادتوں اور بُرے عقائد کو پاک کر دیں تا کہ اس راستے سے انسانی استعداد بلند درجہ تک پہونچ جائے اور اس ہوشیار و پُر ثمر شعاع میں خیر و سعادت کی طرف رہنمائی کریں۔

وحی کی ماہیت اور نوعِ ادراک ہمارے لئے روشن نہیں ہے۔ کیونکہ وحی انسان کی اکتسابی معلومات اور ترقی یافتہ آگاہیوں اور خلاق ذہن کی فعالیت اور دریافت

وصول درک کے سطح سے نہیں ہے۔ اور علمی ومعنوی میراث جو ہم تک پہونچی ہے اس میں بھی اتنی طاقت نہیں ہے کہ اس ارتباط کی خصوصیت کا ادراک کر سکے۔ ہمارے فکر و فکر میں یہ تاریک زاویہ باقی رہ گیا ہے اور شاید آخر تک رمز وابہام کے پردہ میں باقی رہ جائے۔

البتہ کسی ایک فرد کی فوق العادہ پاکیزگی باطنی اور معنویت سرشار اس شخص میں ایک قسم کی آمادگی ابھار کرتی ہے تاکہ فیضان الٰہی کے ساتھ دریافت وحی کی استعداد پیدا ہو جائے اور وہ بہ عنوان رسول منتخب کیا جا سکے۔

لیکن اس استعداد وصلاحیت کے باوجود فرمانبائے آسمانی اور سرچشمہ لایزال وحی سے اتصال مخصوص ارادۂ الٰہی سے تعلق رکھتا ہے صرف باطنی پاکیزگی اور معنویت سرشار وحی کے ارتباط خاص کا تنہا عامل نہیں ہو سکتا ہے بلکہ خدا جس کو چاہے اس کار مہم کے لئے مخصوص کر لے۔

اور چونکہ پیغمبری کا مقصد فرد واجتماع کی ہر قسم کی وہ رہبری ہے جو مائل بہ کمال ہو اور بشریت کے اجتماعی نظام اور قانونی زندگی کے طریقۂ کار کی بنیاد گزار ہو۔ لہذا قہری طور پر اس قسم کی بہت ہی سنگین وطاقت فرسا مسؤلیت کو اپنے ذمہ لینا پڑتا ہے اور اس استعداد کے تحمل اور فراوان اتہامی کو قبول کرنا پڑتا ہے اور پروردگار عالم بھی اس قسم کی مسؤلیت کو ایسے ہی افراد کے سپرد کرتا ہے۔ جو نبوت کے عظیم بار اٹھانے کی قابلیت کو قبول کرنے کی توانائی وقابلیت اور نور وحی سے اقتباس کر کے انسان کے لئے خط مشی اور مسیر زندگی کو معین کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔

اور خدا کا یہ انتخاب ایک ایسا طوفان ہے جو رسول کے تمام وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کے ذہن کو نور بصیرت وحکمت اور بخششہائے ثمر آور سے

سرشار کردیتا ہے ۔ اور وہ رسول اس روشن بینی کی وجہ سے تمام ہوا وہوس، خود خواہی، کج فکری ۔ سے الگ ہو کر اپنی تمام توانائیوں کو ماموریت الٰہی کے انجام دینے میں صرف کرنے لگتا ہے ۔

(۵)

علامہ اقبال لاہوری نے مردانِ باطنی اور انبیاء کے درمیان اس طرح فرق قرار دیا ہے کہ مرد باطنی سیرِ معنوی میں آرام و اطمینان حاصل کر لینے کے بعد اس دنیاوی زندگی میں پلٹنے کی خواہش نہیں رکھتا اور اگر بنا بر ضرورت واپس بھی آگیا تو اس کی بازگشت تمام بشریت کے لئے کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتی لیکن انبیاء کی بازگشت جنبۂ خلاقیت اور ثمر بخش ہوتی ہے اور جریانِ زمان میں اس ارادہ سے وارد ہوتا ہے کہ تاریخ کے دھارے کو منضبط کر دے اور اس طرح سے ایک نئی دنیا کی تخلیق کرے ۔

مردِ باطنی کا آخری مرحلہ آرام و سکون کا حصول ہوتا ہے اور انبیاء کیلئے ــــ آرام و سکون ــــ روحانی طاقتوں کی وہ بیداری ہوتی ہے جو دنیا میں انقلاب پیدا کر دے ۔ اور ان طاقتوں کے بارے میں یہ حساب لگایا گیا ہے کہ یہ کائناتِ بشر کو مکمل طور سے انقلاب سے ہمکنار کر دیتی ہیں ۔ (۱)

وحی نوامیسِ آفرینش کی نہ ضد ہے نہ مخالف اور خود فلسفہ اور ایسے علوم طبیعی ہیں ــــ جو ڈگمانزم (۲) سے آلودہ ہو ــــ بھی کوئی ایسی چھوٹی سی بھی دلیل نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وحی کے ذریعہ انسان اور خدا میں ارتباط

۱۔ احیائے فکر دینی در اسلام ص ۱۴۳

۲۔ ایک نظریہ جس کی بنا پر مسائل ماوراء الطبیعۃ کو عقلی روش سے حل کیا جا سکتا ہے ۔

ناممکن ہے۔ کیونکہ محتوای وحی ضد علم نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ امکان ہے کہ علم اپنی روزافزوں ترقی میں کبھی اس منزل تک پہونچ جائے کہ جہاں سے مناسب معلومات مہیا کر سکے۔

جس طرح ہم کو یہ معلوم ہے کہ ہستی پایان ناپذیر ہے اسی طرح اس کی شناخت و درک کی میزان بھی غیر محدود ہے۔ لہذا ہم کو ہستی اور اس کے عظیم و بیکراں پُرپیچ حقائق کے مسائل کو اس محدود تاریخی زمانہ کے اندر حل کرنے کی فکر بھی نہ کرنی چاہیئے۔ بلکہ دانش بشری کے روزافزوں رو بہ ترقی ہونے کی وجہ سے اس کے رازہائے سربستہ کے کھلنے اور مجہولات کی آگاہی کی توقع و امید رکھنی چاہیئے۔

انبیائے کرام کا مادی وسائل کے بغیر جہان غیب سے اخبار لیکر بندوں تک پہونچانے کا کارخانہ ہمارے اس (ٹیلیفون) کارخانہ سے کم نہیں ہے جو خبروں کو لیتا ہے اور بھیجتا ہے۔ البتہ یہ مشینی نظام اس الٰہی مشینی نظام سے ہزارہا درجہ کمزور و ناتوان ہے۔

اوقیانوس کے اندر کشتیاں، رات کے اوقات میں راڈار کے ذریعہ جہازوں کے ساحل کے قریب آجانے کی اطلاع۔ بغیر پائیلٹ کی اطلاع کے ہوائی جہازوں کو جس مقصد کی طرف لے جانا ہوتا ہے ادھر موڑ دینا۔ یہ تمام چیزیں آج کی دنیا میں محتاج دلیل نہیں رہی ہیں جب انسانی فکر اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ راڈار کی موجوں کی تخلیق کر سکتی ہے تو یہی فکر آخر ایسی موج کیوں نہیں بنا سکتی جو ہماری نظروں سے مجہول ہو۔ اور اس سے پیغام وصول کرے اور بھیجے؟

اب آپ ہی بتائیے کیا انسان اپنے مصنوع سے کمتر ہے؟ ان واقعیات

کے علم کے بعد ہم کو ان مرموز و پیچیدہ مسائل مثل وحی و الہام وغیرہ کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے ۔

موجودات میں گہری فکر ، اور ہمارے سامنے جو مناظر ہیں ان میں کافی غور و خوض ، رفتہ رفتہ آخر کار انسان کو اس منزل تک پہونچا دینگے جہاں بہت سے حقائق اس پر منکشف ہو جائیں ۔

آگاہی کے سلسلہ میں اگرچہ انسان و حیوان کی حس مشترک ہے لیکن بعض حیوانات کی یہ حس انسان سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے ۔ کچھ حیوانات کے اندر ایسے مرموزی ادراکات پائے جاتے ہیں جنکی (چگونگی) سے تمام دانشمندان عالم عاجز ہیں ۔

یہ کوئی ضروری اور لازمی بات نہیں ہے کہ ہمیشہ فلزی مصنوعات ہی امواج کے لئے نشریات کا وسیلہ و ذریعہ ہیں ۔ بلکہ ایک پروانہ جو راڈار کے مشابہ ہوتا ہے اس میں بھی یہ خاصیت موجود ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ گوشت و پوست و ہڈیوں کا بنا ہوا مجموعہ بھی تولید موج کر لیتا ہے پیغام کو لیتا بھی ہے اور بھیجتا بھی ہے ۔ تو کیا انسان کو ایک پروانہ سے بھی زیادہ حقیر تر مان لیں ؟

ایک حیوان کی آنکھ بند کر کے سینکڑوں کیلومیٹر دور پر اس کو لے جا کر باندھ دیجئے لیکن حیرت کی بات ہے کہ کھلنے کے بعد وہ اپنی پہلی جگہ پر واپس آجاتا ہے آخر کون سی طاقت اور قوت ادراک اس کے پاس ہے جو اسکو پہلی جگہ پر پہونچا دیتی ہے ؟

یہ سمت پہچاننے والی حس آخر کس قوت سے پیدا ہوتی ہے کہ حیوان کبھی بھولتا بھٹکتا بھی نہیں ؟ آخر ان موجوں کو کونسا مشینی نظام یا پیمانہ پیدا کرتا ہے ؟

بہت سے دانشمندوں نے پرندوں کی سمت شناسی کی حس کو پہچاننے کیلئے مختلف تجربات کئے لیکن کسی بھی پرندے میں اس صلاحیت کو ختم نہیں کرپائے کیونکہ اصل چیز کو شناخت نہیں کرپائے ۔

جہانِ ہستی کے گوشہ و کنار میں بہت سی ایسی موجیں نشر ہوتی ہیں۔ جن کو ممکن ہے کہ دیگر نقاط میں گرفت میں لیا جاسکتا ہو ۔ مگر ہم اس سے بے خبر ہیں۔ اور ہم جو ابھی تک امواج ، قوہ ، انرجی کی ماہیت سے واقفیت حاصل نہیں کرپائے کس طرح اس وحی کا " جو روشن بین سے ناشی ہوتی ہے اور جو شخصیت ہائے الٰہی کا نفسانی رابطہ ہے انکار کردیں ؟ اگر ہمارے پاس اس کیلئے کوئی رابطہ نہیں ہے تو کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دوسروں کیلئے بھی یہ امکان پذیر نہیں ہے ؟

کوئی ایسی علمی دلیل موجود نہیں ہے جو امکانِ وحی کی نفی کرے ۔۔ آج تک منابعِ وحی کی علمی عدم شناخت اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ حقیقتِ وحی کو بعنوان ایک " پدیدۂ غیر علمی " قبول کرلیا جائے ۔

جب ہم ان حیرت انگیز مخصوص ادراکات و احساسات کو علمی تفسیر کے ساتھ مکمل طریقہ سے حل نہیں کرسکتے جو حیوانات کی زندگی میں ان کی ہدایت کرتے ہیں ۔ اور بعض پرندوں کے اندر جو پیغام رسانی کا مخصوص سسٹم قدرت نے ودیعت کیا ہے اور جس کی بنا پر ان میں بہت دور سے احساس ہوجاتا ہے اور وہ اپنے کو جنسِ مخالف سے ارتباط کے لئے تیار کرلیتے ہیں جب ہم ان کو نہیں پہچان سکتے تو پھر آخر ہم کو کیوں اصرار ہے کہ مسئلہ وحی اور ایک بلند انسان کا مبدء ہستی سے مخصوص رابطہ کو تجرباتی علوم کے ذریعہ حل کریں ؟ اگر مسئلۂ وحی حس و تجربہ کی حدود سے باہر ہے اور دانشِ بشری اب تک اس قسم کی

چیزوں کے حل کرنے سے عاجز رہی ہے تو ہمارے علم کی عدم توانائی اس سلسلہ میں ہمارے لئے کیوں ایجادِ شک و تردید کرتی ہے ۔

مثلاً ذات و حقیقت پروردگارِ عالم کے عدمِ امکانِ شناخت کے بارے میں فرانسیسی دی لامنہ   کہتا ہے ، وہ منکرِ خدا کتنا احمق ہے جو کہتا ہے ؛ چونکہ ہم اسس کی حقیقت کو نہیں جانتے اس لئے خدا نہیں ہے ۔ اگر یہ منکرِ خدا ایک ذرہ ریگ کی حقیقت بتا دے تو میں خدا کو اس کے اختیار میں دیدوں گا ۔

وحی ایک لغت کے ادراک و آگاہی کا نام ہے جو صرف نادر افراد کے یہاں پائی جاتی ہے ۔ اسس آگاہی کی اطلاع ان حضرات کے لئے تو روشن ہے لیکن دوسروں کے یہاں اسس لغت کی شناخت ناممکن ہے ۔ لیکن مطالعہ اور اسس کے آثار و خواص کی تحقیق سے درست یا نادرست طریقہ سے اسس شخص کی گفتگو کو سمجھا سکتا ہے جو اسس وحی کا مدعی ہے اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کیا واقعاً یہ شخص اسس منبع عظیم سے ارتباط خاص رکھتا ہے یا نہیں رکھتا ہے ؟

قرآن مجید کے اندر لفظ وحی کا استعمال متعدد جگہوں پر ہوا ہے ۔ مگر اس کے موارد استعمال کے اختلاف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وحی کے مختلف درجات و مراحل ہیں اور وحی کا سب سے بلند مرحلہ وہی ہے کہ جس سے انسان جہانِ غیب کے دریافت کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ اور یہ وہی ہے جس کو برگزیدگانِ الٰہی بشری ضرورت کی بنیاد پر الٰہی ہدایت کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں ۔

اصولی طور پر کائنات کا ہر ذرہ چاہے وہ نبات ہو یا کراتِ عالم ، کہکشائیں

اور آفتاب و ماہتاب جو اپنی حرارت و درخشندگی و گردش سے ہماری مدد کرتے ہیں یہ سب کے سب اپنے فریضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں وحی کے ذریعہ دنیا کو فائدہ پہونچاتے ہیں۔

وہ نظام و قوانین جو وسیع کائنات پر حاکم ہیں اور انہیں کی بنیاد پر ہر چیز اپنی شکل بندی و شکل گیری پر عمل کرتی ہے یہ ساری چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تمام کائنات پر قانون وحی نافذ ہے۔ بنا برایں کائنات کا ایک لحظہ بھی لطف طبیعت و قوانین الٰہی سے جدا نہیں ہے۔

اس نظریہ سے کس چیز کو وحی کی حکمرانی سے خارج کیا جا سکتا ہے؟ کیا نظام آفرینش کے محتویٰ کی پیروی ایک قسم کا غیر منطقی و غیر علمی تعبد ہے؟

جس طرح خدا نومولود بچہ کی ضرورت کا پہلے سے انتظام کر دیتا ہے اور مناسب و مکمل غذا پستانِ مادر میں دودھ کی صورت میں ذخیرہ کر دیتا ہے۔ اور جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو اسکی غذا پہلے ہی سے موجود رہتی ہے۔ اسی طرح اس میں کون سی اعتراض کی بات ہے کہ انسانوں کے لئے خدا ایک حیات بخش غذا کا انتظام پہلے ہی سے کردے؟ اور جہانِ بشریت کے لئے مناسب و لازم غذا مہیا کردے؟

پس یہ سوچتے ہوئے کہ تمام کائنات میں وحی کا سلسلہ ہے اور یہ کہ ماہ و خورشید شب و روز کی آمد و رفت میں ارادۂ الٰہی کار فرما ہے۔ اسی طرح انبیاء کے دلوں میں وحی کا یہی سلسلہ ہے۔ اور وہاں بھی یہی قانونِ کلی جاری ہے۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے مخصوص کلمات کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسان کے خود مختاری کی نفی نہیں ہوتی۔ اور فطرت کی بلا قیمت مدد انسان کی قدر و قیمت میں کمی نہیں کرتی۔

اب رہی یہ بات کہ ہر فرد بشر پر وحی کیوں نازل نہیں ہوتی؟ اور ہر شخص ڈائریکٹ

جہانِ ملکوت سے رابطہ کیوں قائم نہیں کر سکتا ؟ اور مقررات و نظامِ آسمانی کو خداوندِ عالم سے بدون واسطہ بطور الہام کیوں نہیں حاصل کر سکتا ؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نوعاً انسان بڑی شدت کے ساتھ اپنی غریزی خواہشات اور مادی عوامل و قیود کے تحتِ اثر ہوا کرتا ہے اور یہ ایک ایسا مانع ہے جو انسان کو ان شرائط کا دارا نہیں بننے دیتا جو عالم ماورائے طبیعت سے ارتباط کیلئے لازم و ضروری ہیں ۔

جس طرح ہم دنیا میں ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہونے والی مختلف امواج کو اس وقت تک نہیں سن سکتے جب تک ہمارے پاس ایک دو طرفہ آلہ نہ ہو جو ایک طرف سے فضا میں منتشر ہونے والی امواج کو اسی کیفیت سے درک کر کے اس طرح نشر کرے کہ وہ ہمارے کانوں تک پہونچ جائے ۔

یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کو بھی ایسے ممتاز افراد کی ضرورت ہے جو دو طرفہ ہوں یعنی ایک طرف سے مادی و بشری جنبہ رکھتے ہوں اور دوسری طرف طاقتور معنوی و روحانی خصوصیات کی بنا پر ایک وقت میں دو جہان سے ارتباط رکھتے ہوں اور یہی افراد انبیاء ہوتے ہیں ۔ جو مذکورہ خصلت کی وجہ سے خداوند عالم کی طرف سے کامل انسان ہونے کی وجہ سے پیغام حق کے لینے لئے منتخب ہوتے ہیں ۔ تاکہ انسان ساز قوانین کو مبدء ہستی سے لیکر دنیا والوں تک پہونچائیں ۔

ان تمام باتوں کے علاوہ خود رہبری بھی ایک ضروری مسئلہ ہے یہ معاشرہ جس طرح قانون کا محتاج ہے اسی طرح رہبر و پیشوا کا بھی محتاج ہے رہبر کے بغیر معاشرہ بلاشک و شبہ بے سروسامان اور ہرج و مرج میں مبتلا ہو جاتا ہے جب رہبر کی ضرورت مسلم ہے تو بھلا انبیاء سے بہتر کون افراد ہونگے جو معاشرہ کے رہبری کی ذمہ داری اور قانون کی پاسداری اور مقررات کے اجراء کی نگرانی کر سکیں ؟

کیا جو حضرات فضیلت و معنویت و پاکیزگی میں سب سے بہتر ہوں اور ہر قسم کے خود پرستانہ رجحان سے دور ہوں وہ انسانوں کی رہبری و پیشوائی کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے دوسروں سے زیادہ لائق و مناسب نہیں ہیں ؟

رہبری کی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف انبیائے کرام کی ہی شخصیت ایسی ہے کہ جو انسان کے دونوں حصوں کے لئے مناسب ہے ۔ (یعنی) جہانِ ملکوت سے قوانین لینے کے لئے ۔ اور خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ بننے کے لئے ۔ اسی طرح معاشرہ کی رہبری اور حکومت کے لئے اور قوانین کی حفاظت و نگہبانی کے لئے یہی حضرات مناسب ہیں ۔

یہ نکتہ بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے کہ جس طرح کائنات کے مختلف ادوار میں رشدِ انسان کے مراحل طے ہوتے ہیں ۔ اسی طرح انسانی رشد کے تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ وحی بھی تدریجی طور پر ہمراہ ہوتی ہے ۔ اور انسان کے فرہنگی واجتماعی بلوغ میں جس طرح تفاوت ہوا کرتا ہے ۔ اسی طرح یہ بھی نظامِ آفرینش کے تدریجی مراحل کے ساتھ حاصل ہوتی رہتی ہے ۔

تبلیغ میں انبیاء کا ثبات قدم

انبیاء کی صداقت اور ان کے وجود کی گہرائی میں چھپے ہوئے عمیق ایمان اور تعلیمات و تبلیغِ رسالت کے سلسلے میں ان کی زحمتوں کا کون انکار کر سکتا ہے۔ اسی طرح ستمگاروں اور تباہی و بربادی کے خلاف زبردست مبارزت و صلح ناپذیر اقدام کا کون منکر ہو سکتا ہے؟

ان کی صداقت و حسن نیت اور انکی وہ تعلیمات جنھوں نے ملتوں کے قلب و روح کو مسخر کر لیا ہے کی نفی نہیں کی جا سکتی۔

تبلیغ کے سلسلے میں ان حضرات پر انحصار اور اس کا دفاع اور اپنی رسالت کی ضرورت کا احساس یہ ایسی چیزیں ہیں کہ دنیا کے دانشمندوں کے علمی نظریات پر قیاس کرنے کے بعد کامل طور سے معلوم ہو جاتا ہے۔

کیونکہ دانشمندوں کی علمی شخصیت چاہے جتنی بزرگ ہو اور چاہے کتنے ہی ترقی یافتہ علمی سرمایہ سے استفادہ کیا ہو جب وہ اپنی رائے پیش کرتے ہیں تو اس میں خود ان کی نظر میں احتمالِ نقص کا امکان رہتا ہے۔ اور چونکہ گذرگاہ تکامل میں کسی قسم کی رکاوٹ و ٹھہراؤ قابلِ قبول نہیں ہوا کرتا اسلئے تمام ابعاد میں تحقیقِ بیشتر کا راستہ کھلا رکھتے ہیں تاکہ تلاشِ مدام اور تحقیقِ بیشتر کے ذریعہ علمی آراء و نظریات میں اصلاح یا تکمیل کیجا سکے لیکن انبیاء کی روش اس قسم کی نہیں ہوتی وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر گہرا عقیدہ رکھتے ہیں ـــ اس میں کسی بھی قسم کے احتمالِ نقص کا تصور بھی نہیں کرتے ـــ

اور رسالت کے اجراو ترقی میں ـــ رسالت جو تابع وحی ہوتی ہے ـــ کسی قسم کے تزلزل و تردید کے بغیر ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ برابر پامردی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی تبلیغ میں مشغول رہتے ہیں ۔ اور آخری دم تک انقلاب اور فرہنگِ الٰہی کی توسیع میں کوشاں رہتے ہیں ۔

۵

اس میں شک نہیں کہ خطا انحراف پر قائم رہنا باعث انگیز ہے اور خلاف حقیقت راستہ چلنا تشویش و اضطراب کا باعث ہوتا ہے ـــ لیکن تاریخ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی جس میں انبیا نے تبلیغِ رسالت کے سلسلہ میں معمولی سے خوف کا مظاہرہ کیا ہو ۔

یہ خصوصیت ہم کو آمادہ کرتی ہے کہ ہم اس حقیقت کی تلاش کریں کہ آخر یہ حضرات اپنے تمام خطبوں میں بغیر کسی مقدمہ کے وضاحت اور اطمینانِ خاطر کے ساتھ کیوں تبلیغ کرتے تھے ؟ اور بشریت کو اپنی تعلیمات کی پیروی کرنے میں نجات کا مژدہ کیوں سناتے تھے ؟

کیا اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو سکتی ہے کہ ان کی تعلیم اور ان کا فرمان حقائق ہستی کے جڑوں میں پیوست اور اصلی دانش و آگاہی کے منبع سے متصل تھا ؟

ان باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے دانشمند حضرات خود اپنی نظر میں بکثرت اشتباہ و خطا سے دوچار ہوتے ہیں ۔ اور بکثرت یہ بات دیکھی گئی ہے کہ خود محقق اپنے عصرِ تحقیق و جستجو میں ایک ہی موضوع کے سلسلہ میں متناقض آراء کا اظہار کرتا ہے ۔ بلکہ مختصر سی بات یہ ہے کہ کوئی بھی صاحب نظر اپنی علمی زندگی میں ہر قسم کی غلطیوں سے پاک نہیں رہا ہے ۔

آئنسٹائن کہتا ہے :

اس دور میں کوئی ایسا دانشمند نہیں ہے جو اپنی گذشتہ غلطیوں کے باوجود اپنے کو اس لائق سمجھے کہ جن مطالب کو وہ بیان کر رہا ہے وہ آخری حقائق ہیں برخلاف نیوٹن جیسے صاحب نظر لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ آج جو چیز ہماری نظر میں واضح ہے وہ آئندہ نسل کی نظر میں مبہم ہو اور ہمارے بعد کی نسلیں ہمارے کارناموں کو اسی نظر سے دیکھیں جس نظر سے آج ہم اپنے بزرگوں کے کارنامے دیکھتے ہیں۔ (۱)

جس طرح دستگاہ خلقت انسان کی مادی ضرورتوں میں انسان کی رہنمائی غلط راستوں پر نہیں کرتی۔ اسی طرح مقصد نہائی کی طرف ہدایت کرنے میں وحی بھی غلطی نہیں کرتی۔

نیز انبیاء کے بارے میں کبھی یہ نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنا ایک پروگرام پیش کر کے اپنی بات واپس لے لی ہو اور اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اسکی جگہ دوسرا پروگرام پیش کیا ہو۔ برخلاف مفکرین و فلاسفہ کے یہاں بارہا ایسا ہوتا آیا ہے۔

ایک اور فرق بھی نمایاں ہے۔ مفکرین دہر انکشاف حقائق کے سلسلے میں جو کامیابی حاصل کرتے ہیں وہ دفعۃً نہیں ہوتی بلکہ رفتہ رفتہ اور مختلف علمی و تجرباتی ادوار سے گذرنے کے بعد ہوتی ہے۔ جب کوئی علمی شخصیت پہلی مرتبہ مجہول چیز کے انکشاف کے لئے اقدام کرتی ہے تو انجام تک پہونچتے پہونچتے ایک طویل زمانہ گزر جاتا ہے لیکن انبیاء حقیقت تک پہونچنے کے لئے نہ کسی مقدمہ یا تجربہ کے محتاج ہوتے ہیں اور نہ وہ شک و تردید میں مبتلا ہوتے ہیں بلکہ حقیقت کو اس کے تمام ماله و ما علیہ

۱۔ جہان و آینشٹائن ص ۱۳۰

کے ساتھ علمی و تجرباتی مراحل سے گذرے بغیر مبدء ہستی سے حاصل کر لیتے ہیں اور دفعۃً اعلان بھی کر دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ انبیاء کے تعلیمات اساسی کی وسعت و تنوع و جامعیت تمام صورتوں میں دیکھی جا سکتی ہے وہاں نہ تو محدود و تنگ نظر قالب کے اندر ذہنی و منطقی مطالعات کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ استاد کی رہنمائی ضروری ہوتی ہے بلکہ یہ حضرات جو کچھ بھی پیش کرتے ہیں وہ علمی و فکری دقیق تحلیل پر مکتب کامل و آزادی بخش کے عنوان پر مشتمل ہوتی ہے۔

اس حقیقت کی وضاحت اس بات سے ہو جاتی ہے کہ ہم جس وقت تمام ادیان کے پروگرام و اصولوں پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام وسعتیں اس زمانہ کے مفکرین کے یہاں نہیں ہیں جس وحشیانہ ماحول اور حد سے زیادہ گرے ہوئے معاشرہ میں انبیائے کرام نے پرورش پائی ہے وہاں ممکن ہی نہیں ہے کہ ادیان الٰہی جن ثمربار و بلند نظریات کے حامل ہیں وہ کسی ایک انسان سے حاصل کئے گئے ہوں۔

کیونکہ ایسے معنویت و آگاہی و جامعیت سے سرشار متون جو فردی اور اجتماعی زندگی کے تمام مراحل سے مربوط اور واضح و عمیق ہو کسی بھی معاشرہ میں بلکہ تاریخ کے کسی دور میں مفکرین علم و دانش سے دیکھے نہیں گئے یعنی ایسی تعلیمات جو پر ثمر اور اپنے زمانہ کے دریائے فرہنگ کے مواج ترین ہوں اور اس میں نابرابری کا وجود نہ ہو دیکھے نہیں گئے۔

انبیاء کے راستہ کا انتخاب صرف ایک ذہنی اور عقیدت کی بات نہیں ہے کہ جو اعتقادی حیثیت سے باقی رہے۔ بلکہ درحقیقت لوگ اس راستہ کو اپنا کر اپنے مخصوص نظام زندگی کا انتخاب کرتے ہیں۔ کیونکہ الٰہی نظام جہان بینی فرد و اجتماع کے رفتار کو معین کرتی ہے ___ پھر سوچنے کی بات ہے کہ ایسی جامع تعلیمات کا مرکز کیا وحی الٰہی کے

علاوہ دوسری چیز ہو سکتی ہے؟ یہ تعلیمات ایسی ہیں کہ خود ان سے خدائی پیغام کی صداقت کی خوشبو آتی ہے۔

ایک اور واضح فرق ملاحظہ فرمایئے۔ محققین کی تحقیقات میں غور و فکر کرنے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہر اہل علم کی تلاش جدا اور علیحدہ ہے اور ہر شخص علمی مسائل کی تحقیق میں اپنے طریقہ سے کام کرتا ہے اور اپنی تحقیق کے مقابلہ میں دوسرے محققین سے اس کا کوئی واسطہ و رابطہ نہیں ہوتا۔ اور اگر کبھی اتفاق سے محققین کی تحقیقات اور ان کے نظریات ایک دوسرے سے مرتبط ہو جائیں تو یہ مسائل علمی کے متقابل روابط کی وجہ سے ہوگا اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ ارتباط محققین کے مورد نظر تھا۔

لیکن انبیاء کے سلسلے میں صورتحال دوسری ہے۔ ہر نبی اپنے سے پہلے والے نبی کی تصدیق کرتا تھا اور تائید کرتا تھا۔ اور انبیاء گذشتہ کی تبلیغ کے سلسلہ میں ہونے والی زحمتوں کو سراہتا تھا اور ان کی تجلیل کرتا تھا اور یہ ثابت کرتا تھا کہ تمام مکتب ہائے آسمانی ایک ہی مرکز سے اکتساب فیض کرتے تھے۔ بس صرف اتنی بات ضرور ہے کہ ان مکاتب میں ہر مکتب اپنے سے پہلے مکتب کی تکمیل کرتا تھا۔

قرآن مجید رسول اسلام کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

(اے رسولؐ) ہم نے تم پر بھی برحق کتاب نازل کی کہ جو کتاب (اسکے پہلے سے) اس کے وقت میں موجود ہے اسکی تصدیق کرتی ہے اور اسکی نگہبان (بھی) ہے۔[1]

انجیل میں خود حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے:

یہ خیال ہرگز نہ کرنا کہ میں توریت یا انبیاء کے صحیفوں کو باطل کرنے کیلئے

۱۔ سورہ مائدہ آیت نمبر ۴۸

آیا ہوں ۔ میں اس لئے نہیں آیا کہ باطل سازی کروں بلکہ (ماقبل ادیان کی) تکمیل کروں[1]

یہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ تمام انبیاء ایک ہی بات پر متحد تھے اور یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ انکی تعلیمات غیر محدود ہیں ۔ لیکن مشیتِ الٰہی اور منبعِ وحی سے خارج نہیں ہیں ۔ اور چونکہ مبدء ہستی پر انبیاء کا ایمان بہت پختہ ہوتا ہے اس لئے استقلال، عدم تزلزل، قاطعیت انکی مخصوص صفت ہے ۔

۱۔ انجیل متی باب ۵ آیت ۱۷

عِصمَت اَنبیَاء

نبوت اور معاشرہ کی رہبری بہت ہی حساس مقام ہے اس منصب کے لئے مخصوص امتیازات کی ضرورت ہے جب تک وہ اہم اور مخصوص امتیازات حاصل نہ ہو جائیں اس وقت تک انسان اس منزل تک ہرگز نہیں پہونچ سکتا

منجملہ ان شرائط کے ایک یہ ہے کہ کمالِ ایمان و شدتِ تقویٰ کی بنا پر اندرونی طور سے ان کے پاس ایک ایسی طاقت ہو جو صرف فسادِ اخلاق و تباہی اور گناہ سے روکنے والی ہی نہ ہو بلکہ اس کے بارے میں ارادہ بھی نہ کرے اور یہ طاقت ایسی ہو کہ نبی اپنی پوری زندگی میں ___ خواہ نبوت سے پہلے یا بعد ___ گناہ کا نہ ارتکاب کرے نہ ارادہ۔

یہ بات دیکھا جاتا ہے کہ معاشرہ میں انسان کی جتنی قدر و قیمت ہوگی اسی اعتبار سے اس انسان کی ضرورت اور عمومی اطمینان و اعتماد بھی ہوگا۔ پھر اس اعتبار سے کیا معاشرہ کی رہبری سے زیادہ اہم و پر مسئولیت منصب کوئی اور ہو سکتا ہے؟ اور وہ بھی مادی و معنوی تمام زندگی کے تمام شعبوں میں لوگوں کی رہبری؟

اس بنا پر انبیاء کی بعثت کا عظیم مقصد پوری کائنات میں ایک سلسلۂ تعلیمات و آسمانی دستوروں کے ذریعہ انسان کی تربیت و ہدایت کرنا ہے۔ اور لوگ بھی اپنے ان دینی وظائف و مقررات کی پابندی کریں جن کو انبیاء بعنوان وحی و قوانینِ الٰہی لے کر آئے ہیں تو پھر فطری طور سے تعلیمات پر عمل کرنے سے یہ

لوگ فائدہ حاصل کریں گے اور صد در صد اطمینان ہوگا کہ یہ سلسلۂ تعلیمات مبدأ ہستی کی طرف سے صادر ہوا ہے۔

کیا کوئی بھی شخصیت اس قدر محلِ اطمینان ہر دم ہو سکتی ہے کہ وہ جو بھی کہدے لوگ دل کی گہرائیوں سے بے چون و چرا اسے تسلیم کریں ؟

کیا اس شخص کے علاوہ جو سلاحِ عصمت سے آراستہ ہو اور فضائل کے دریا اس کے وجود میں موجیں مار رہے ہوں کوئی دوسرا اس قسم کے اطمینان کا شائستہ ہو سکتا ہے ؟

اگر وحی کے لینے اور پہونچانے میں انبیاء پر صد در صد اطمینان نہ کیا جا سکے تو مقصدِ رسالت کہ جو تکامل بشریت ہے۔ محفوظ نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اگر انبیاءً احکامِ الٰہی کے پہونچانے میں معصوم نہ ہوں تو پھر راہ کمال سے معاشرہ کے انحراف میں شبہ نہ رہے گا۔

اگر انبیائے کرام گناہوں کی آلودگی اور معنوی بیماریوں سے محفوظ نہ ہوں اور پلیدگیوں کے اثرات سے مصونیتِ روانی نہ رکھتے ہوں تو انسانی صفات کے لحاظ سے چاہے وہ جتنے بلند ہوں یہ احتمال بہرحال رہتا ہے کہ مادی دنیا کے فریبندہ مظاہر سے اور جاہ و مقام کے تحتِ تاثیر کی وجہ سے اہدافِ شخصی کی بنا پر لغزش سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اور جب یہ احتمال ہوگا تو بدیہی طور پر ان کے ماننے والے میں قرآنِ خدا کی اتہام دہی میں اپنے رہبروں کے بارے میں وہ لوگ شک و تردید کے شکار ہو جائیں گے۔

نبی جو مخلوق کا رہبر ہوتا ہے اس کو بہت ہی با اخلاق ہونا چاہیئے اور تمام لوگوں کو اپنی تمام زندگی میں کمال حاصل کرنے کیلئے اس کی پیروی کرنی چاہیئے اگر نبی کے اندر معمولی سا انحراف، دروغ گوئی، میلان بہ گناہ پایا گیا تو کیا احتمالِ

کذب، خیانت، خلاف حقیقت بیان کا احتمال ہمیشہ کے لئے اس میں منتفی ہوجائے گا؟

اور لوگ اسکو رہنما، نمونۂ فضیلت و پاکیزگی کے عنوان سے قبول کرنے پر تیار ہوجائیں گے؟

عقل و منطق کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ کیونکہ کوئی بھی شخص کامل اطمینان کے ساتھ اس شخص کی باتوں کو جس کی زندگی تاریک ہو، اور جو ادعائے نبوت سے پہلے گناہوں میں مبتلا رہا ہو اور فساد و برے اخلاق کا مبلغ رہا ہو۔ بہ عنوان وحی و دستور الٰہی قبول کر ہی نہیں سکتا چاہے ادعائے نبوت کے بعد اس کے اندر انقلاب پیدا ہوگیا ہو اور معنوی ترقی ہوگئی ہو۔ اسی طرح اس شخص کی تعلیمات کو دنیا پیام آسمانی نہیں سمجھے گی۔ خصوصاً ایسے مسائل میں تو ہرگز قبول نہیں کرے گی جہاں تجربہ کا راستہ بند ہو۔

۵

اس لئے تجلی وحی کی پہلی اور ضروری شرط انبیاء کا اخلاص اور اندرونی طور سے کامل پاکیزگی ہے۔ اسی طرح لوگوں کا انبیاء سے عشق کرنا مقامِ عصمت و شائستگی کے زیر سایہ ہی ہوسکتا ہے۔

قول سے زیادہ عمل موثر ثابت ہوتا ہے۔ مربی کے تمام اعمال و صفات کا نمونہ وہ لوگ ہوا کرتے ہیں جو اس سے تربیت حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ تربیت کرنے میں عملی پہلو کی حیثیت درخت کے شاخوں جیسی ہوتی ہے جو تربیت حاصل کرنے والے کی شخصیت میں بہت زیادہ نفوذ کرتی ہے اور اتنی مؤثر ہوتی ہے کہ تاثیر بیان و گفتگو کا اس پر قیاس ہی نہیں کیا جاسکتا۔

اب اگر جو شخص روحانی و معنوی و معاشرتی اعتبار سے بلند مقام پر

نائز ہو وہی گناہوں کے گرداب میں پھنسا ہو تب تو بشریت کے لئے واویلا ہے
اور جو شخص ایسا ہو اور تقویٰ سے خالی ہو کیا وہ رشد و فضیلت کے لئے مناسب
فضا تیار کر سکتا ہے؟ اور انسانوں کے باطن میں دیرپا اور مستقل انقلاب
پیدا کر سکتا ہے؟ اور کیا وہ نفوس کی تربیت اور انسانوں کی اخلاقی و رہبری
کی ذمہ داری لے سکتا ہے؟ اور لوگوں کے ذہنوں میں تقویٰ و فضیلت کے
بیج بو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا عصمت ضروری ہے۔

(۵)

ایک گناہ بھی کر لینے سے انبیاء کا مقصد بعثت ___ یعنی انسان کی تربیت ___ فوت ہو جاتا ہے۔ آلودہ بگناہ دوسرے کو گناہ سے کیونکر پاک کر سکتا ہے؟
"آنکہ خودش گم است کرا رہبری کند" ۔ جو شخص اخلاقی اور روحانی اعتبار سے خود ہی ناقص ہے وہ انسان کی اخلاقی و روحانی تربیت کیونکر کر سکتا ہے؟

بلکہ انبیاء کے صرف دوران نبوت کے اعمال و کردار ہی کو نہیں دیکھنا چاہئے اور نہ اس زمانہ کے اعمال کو الگ کر کے ان کے اسی زمانہ کے اخلاقی و روحانی خصوصیات کو دیکھنا چاہئے۔ بلکہ تحقیق کا دامن وسیع کر کے ان کی پوری حیات طیبہ کا مطالعہ کرنا چاہئے کیونکہ صرف آغاز بعثت سے ہی پاکیزگی کا مطالعہ کافی نہیں ہے۔

انبیاء کا مبدء ہستی سے دائمی و مستحکم رابطہ اور تمام زندگی میں گناہ سے آلودہ نہ ہونا ایک ضروری امر ہے۔ اور الہٰی شخصیتوں کو تو کسی بھی قیمت پر گناہ سے آلودہ ہونا ہی نہیں چاہئے۔ کیونکہ پہلے کی کی ہوئی برائی ان کے مخلوق کو خدا کی طرف ارشاد و ہدایت کرنے اور پاکیزگی و برائیوں سے دوری کی دعوت میں بہت بڑا مانع ثابت ہوگی۔

جو شخص کل تک ناپاک لوگوں کا حامی تھا اور گناہوں سے آلودہ تھا ۔ اپنی عمر کا ایک حصہ گناہ کرنے میں صرف کر چکا تھا فطری طور پر لوگوں کے ذہنوں میں اس کے کارنامے زندہ ہونگے پھر بھلا لوگ اسکی بات کیونکر مان لیں گے ؟ بلکہ اس کے ماضی کی داستانوں کو بطور دلیل پیش کریں گے ۔ مختصر یہ ہے کہ ایک روحانی انقلاب تنہا ان کے ماضی کی برائیوں کو ختم نہیں کر سکتا ۔ اور نہ دلوں سے اسکی یاد کو ختم کر سکتا ہے ۔

تاریخ انبیاء کی تحقیق کے سلسلہ میں سطحی طور سے اور فہرست شماری سے کام نہ لینا چاہیئے ۔ بلکہ انکی زندگی کے مختلف گوشوں کی شناخت کے لئے ہر محقق کا فریضہ ہے کہ احراز مقام نبوت سے پہلے بہت ہی گہری نظر سے مطالعہ کرے تاکہ وہ خود اس حقیقت تک پہونچ جائے کہ سخت ترین دشمن اور کینہ توز عدو جو آسمانی پیام کے عدم نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے اور انتہا یہ ہے کہ انبیاء کو دیوانہ و پاگل مشہور کرتے تھے تاکہ الٰہی پیغام وسیع پیمانے پر نشر نہ ہو سکے ۔ وہ بھی اپنی ان ساری تگ و دو اور مخالفت کے باوجود انبیاء کو بدکار یا بداخلاق کہنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے ۔

کیونکہ اس زمانہ کے لوگوں کے سامنے انبیاء کا چہرہ اتنا پاک تھا کہ اگر مخالف الزام بھی لگاتے تو کوئی تسلیم ہی نہ کرتا ______ اور اگر بعثت سے پہلے ایک مرتبہ بھی ان حضرات کا دامن داغدار ہو جاتا تو انکی عوامی پوزیشن خراب کرنے میں اس حربہ کا استعمال ضرور کیا جاتا ۔ اور یہ بدیہی ہے کہ انکی کمزوریوں اور بداخلاقیوں یا بدکاریوں کو طشت ازبام کر کے ان کو بے اثر بنا دینا بہت ہی آسان کام تھا ۔ اور عوام کالانعام کا تو عالم ہی یہ ہوتا ہے کہ ذرا سی کمزوری کا علم ہو جائے تو پھر ساری عقیدت دھری رہ جاتی ہے ۔ مگر مخالف یہ سب کچھ نہ کر سکے کیونکہ انبیاء معصوم تھے ۔

یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ انبیاء کی پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے وہ مفاسد و تاریکیوں سے بھرپور تھا۔ اس ماحول میں تقویٰ و پاکیزگی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ماحول اور اس فضا کا تقاضا تو یہی تھا کہ یہ حضرات بھی اسی رنگ میں رنگ جاتے ____ مگر اس کے برخلاف اس تاریک ترین دور میں ایسی فضیلت و تقویٰ و شرف انسانی کا حامل ہونا اور درخشندہ ستارے کی طرح چمکنا خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ انبیاء کی شخصیت ہر لحاظ سے کامل ہوتی ہے اور یہ حضرات معصوم ہوتے ہیں اور اخلاقِ انسانی کے کامل نمونہ ہوتے ہیں۔

۲

قرآن مجید سے بھی یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ نبوت و امامت کے بلند مقام تک رسائی ہر قسم کی روحی و معنوی گناہ و پلیدگی سے پاک ہونے ہی پر ممکن ہے۔

جب خداوند عالم نے جناب ابراہیم خلیل اللہ کو عہدۂ امامت پر فائز کیا تو انہوں نے بارگاہ ایزدی میں یہ سوال کیا کہ پالنے والے میری نسل کے افراد کو بھی اس جلیل مرتبہ پر فائز فرما! تو صریح طور پر جواب آیا کہ میرا عہد صرف انہیں افراد تک پہونچے گا جنھوں نے ظلم کا ارتکاب نہ کیا ہو ____ یعنی نہ اپنے اوپر نہ دوسروں پر ____ (۱) یعنی اس آیت میں ظلم و ستم سے پرہیز کو صریحی طور پر رہبری اور عہد امامت کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے۔

بنابرایں قرآنی نظریہ سے انبیاء کے لئے عصمت یا عدم ظلم نہ کرنا شرط ہے کیونکہ ظلم و ستم بھی ساحتِ قدسِ الٰہی میں ایک قسم کی جسارت ہے۔ اس لئے خدا اس شخص کو نبی یا امام ہرگز نہیں بنائے گا جس کا دل گناہ سے سیاہ اور ہاتھ ظلم

۱۔ سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۲۴

وستم سے آلودہ ہوں۔ قرآن کے بعض آیات میں جو بعض انبیاء کی طرف گناہ کی نسبت دی گئی ہے اس میں اگر نوعِ گناہ کی شناخت کرلی جائے تو مسئلہ آسانی حل ہوجائیگا۔ کیونکہ گناہ میں درجات ہوتے ہیں مثل مشہور ہے: حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ (ابرار کی نیکیاں مقربین کے اعتبار سے گناہ ہیں) ایک گناہ تو وہ ہوتا ہے جو واقعی گناہ ہے یعنی اوامر الٰہی کی مخالفت۔ اس قسم کے گناہ پر سزا و عقوبت دی جاتی ہے۔ انبیاء کے یہاں اس گناہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ــــــ ایک گناہ واقعی گناہ نہیں ہوتا صرف نسبی گناہ ہوتا ہے یعنی اس قسم کے گناہ کے ارتکاب پر کسی آسمانی قوانین کی مخالفت نہیں ہوتی اور نہ اس کے کرنے پر کوئی سزا ہوتی ہے۔ البتہ انبیاء کے اعلیٰ مرتبہ سے وہ مناسبت نہیں رکھتی اور ان کے شایانِ شان نہیں ہے ــــــ مثلاً کوئی بزرگ و محترم شخصیت سڑک پر روٹی کھاتے ہوئے چلے کر گناہ نہیں ہے مگر شایانِ شان اس محترم شخصیت کے نہیں ہے۔ مترجم۔

مذہبی اور اجتماعی امور میں مختلف شخصیتوں سے ایک ہی قسم کی توقعات وابستہ نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ ہر شخص کے معلومات، طاقت، اہمیت کے لحاظ سے اسی قسم کی توقع کیجاتی ہے۔

اگر ایک جاہل آدمی عوام پسند و شیریں تقریر کرے تو چاہے وہ مفہوم و معنی کے اعتبار سے بالکل ہی بے مغز ہو مگر تحسین انگیز ہے۔ لیکن اگر وہی تقریر ایک دانشمند عالم و عاقل شعلہ بیان مقرر کرے تو غیر پسندیدہ ہے۔ اسی طرح انبیاءؑ کی عظیم شخصیت کو ان کے اعمال و کردار کے آئینہ میں دیکھئے۔ یہ حضرات جیسے اس علم و ایمان کے عظیم ذخیرے ہیں اور واقعیات کے عالم ہیں آگاہی و معرفت کے سرشار ترین منبع تک دسترسی رکھتے ہیں اگر یہ لوگ ذرہ برابر بھی خدا کی طرف

سے غفلت برتیں تو انکے لئے بہت بڑی لغزش ہے جو ان کے درخشاں چہرۂ نبوت پر ایک غبار ہے کیونکہ یہ بات ان حضرات کے شایان شان نہیں ہے۔

حالانکہ اگر یہی بات دوسروں سے ہو تو توبیخ و سرزنش کے قابل نہیں ہے۔

اسکے علاوہ مخلوق کی رہبری کا درجہ اتنا حساس ہے کہ اگر رہبر و پیشوا سے لغزش و خطا ہو جائے تو جس ملت کی یہ زعامت کرتے ہیں اس کی عزت و شرف پامال ہو جاتا ہے اور معاشرہ کا دامن بھی اس کی آلودگی سے محفوظ نہیں رہ سکے گا

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عصمت عطیۂ الٰہی ہے کہ جس کی وجہ سے انبیاء گناہ و برائی کرنے پر قادر ہی نہیں ہو سکتے تو پھر یہ کوئی خوبی کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ایسی صورت میں انبیاء کی برتری اور افتخار اور رفعت بارگاہ ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ قدرت نے ان کو اس طرح پیدا ہی کیا ہے کہ وہ گناہ نہیں کر سکتے تو اس میں انبیاء کا کیا کمال ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر عصمت جبری ہو یعنی عصمت کے بعد انبیاء سے سلب قدرت از گناہ کر لیا جائے اور ان کو گناہ نہ کرنے پر مجبور کر دیا جائے تب تو اعتراض صحیح ہے۔ لیکن یہاں صورت حال اس کے برخلاف ہے عصمت کے بعد انبیاء گناہ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں مگر گناہ نہیں کرتے ہیں (جیسے انسان اپنی ماں بہن سے زنا کرنے پر قادر ہے مگر اس کی قباحت کی وجہ سے کوئی ایسا اقدام نہیں کرتا ہے۔ مترجم) یعنی اگر ایسا ہوتا کہ انبیاء کسی بھی قسم کا گناہ نہ کرنے پر مجبور ہوتے اور فرمان خداوندی کی اطاعت اور پاکیزگی نفس پر مجبور ہوتے تب تو اعتراض درست تھا مگر یہاں صورت حال یہ نہیں ہے۔ کیونکہ عصمت جو ایمان قوی اور آگاہی کامل پر مبنی ہے وہ ارادہ و اختیار کی نفی نہیں کرتی۔

انبیاء کے تمام اعمال دوسروں کی طرح اختیاری ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ضروری

نہیں ہے کہ انبیاء کے معصوم ہونے کے لئے خارجی دباؤ کی ضرورت ہو اور اگر کوئی شخص ذاتی طور سے گناہوں سے اجتناب کرتا ہو تو کیا اس سے کوئی اشکال پیدا ہوتا ہے ؟

انبیائے کرام بڑی گہری نظر سے شکوہ و جلال خداوندی اور اس کی اس وسیع کائنات کے اندر عظیم طاقت و قدرت کا بدرجہ اتم ادراک رکھتے ہیں اور ان کے اعضاء و جوارح ، دل و جان ، افکار سب کے سب عشق الٰہی میں سرشار رہتے ہیں تو پھر کیونکر یہ سوچا جاسکتا ہے کہ یہ حضرات اپنے قلوب کو گناہ کی طرف مائل کریں گے اور احکام الٰہی کی مخالفت کریں گے ؟

اسی طرح یہ حضرات گناہ کے وحشتناک نتائج سے بخوبی آگاہ ہیں تو پھر انکے یہاں گناہ کرنا تو درکنار تصور گناہ بھی نہیں ہو سکتا ۔

یہ بات درست ہے کہ نتائج گناہ کا علم سبب عصمت نہیں بن سکتا۔ لیکن انبیاء کی عصمت اس میزمند و واقع غائی علم سے ناشی ہے کہ جو گناہ کے جوابدہی کے آثار سے اس حد تک چشم دل سے دیکھتی ہے کہ جہاں پر صدور گناہ کا تصور ناممکن ہو جاتا ہے ۔

ایک ڈاکٹر کسی ایسے ظرف کو ہرگز نہیں استعمال کریگا جس کے بارے میں اسکو معلوم ہے کہ یہ میکروبات و جراثیم سے نہ صرف مملو ہے بلکہ اس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہیں۔ کوہ پیمائی کرنے والے اپنی عمر کوہ پیمائی میں گذار دیتے ہیں لیکن کبھی یہ سوچتے تک نہیں کہ چلو اپنے کو اس پہاڑ سے جان بوجھ کر گرا دیں ۔ پھر انبیاء اگر گناہ کے خطرناک نتائج سے آگاہی کے بعد گناہ نہیں کرتے تو کیا تعجب ہے ؟

ڈاکٹر ظرف آلودہ بہ جراثیم سے کھانے اور نہ کھانے دونوں پر قادر ہے ۔
کوہ پیما اپنے کو پہاڑ سے گرا دینے اور نہ گرا دینے دونوں پر قادر ہے لیکن چونکہ نتیجہ سامنے ہے لہذا نہ ڈاکٹر کھائے گا اور نہ کوہ پیما اپنے کو گرائے گا ۔

یہیں سے علم ـــــ جو شناخت آگاہانہ کا ایک نتیجہ ہے ـــــ اور عمل

جو نمود و تظاہر خارجی کا نام ہے ـــــ کے درمیان رابطہ کو پہچانا جا سکتا ہے اور محسوس کیا جا سکتا ہے کہ عمیق و دقیق ذہنی آگاہی کس طرح عینیت حاصل کرتی ہے۔ اور ان تاثیرات و تاثیر اور ذہنی و عینی فعل و انفعال کے درمیان انسان کی موقعیت کیا ہوتی ہے۔

اسطرح انبیاء میں بھی عصمت و ژرف نگاہی برائے تمام تاثیرات گناہ اور خشم و کیفر الٰہی اس طرح روشن و واضح ہے کہ فاصلۂ زمانی یا مکانی ان کے یقینی و عمیق ایمان میں کوچکترین تاثیر نہیں کر سکتا۔

بے دریغ فداکاری و قربانی کے نتیجہ میں فولادی ارادہ، مبدء ہستی کی طرف دائمی توجہ، راہ حق و استقرار عدالت کے سلسلہ میں مشکلات و دشواریوں سے خوفزدہ نہ ہونا، اپنی پوری ہستی کو رضائے حق کے حصول کے لئے وقف کر دینا (یہ تمام باتیں) وہ قوی عامل ہیں جو مردان خدا کو محفوظیت عطا کرتی ہیں کہ وہ اپنی تمام توانائی و قدرت کے باوجود گناہ نہیں کرتے بلکہ ان کے حریم پاک تک تصور گناہ کی بھی کوئی صورت نہیں ہے۔

یہ جامع محفوظیت مقام ربوبیت کی عظمت سے کامل آگاہی اور کیفر عمل کے بارے میں علمی احاطہ کا ڈائریکٹ اثر ہے۔ اور بلند معنویت کا نشانہ ہندہ ہے جو ان کے وجود کے اندر سرکشی تمایلات ہیں انکو لگام دینے والا ہے تاکہ یہ حضرات اپنے معین راستہ سے ایک قدم ادھر اُدھر نہ ہٹیں۔

انبیائے کرام ایک اہم مرتبہ کے مالک ہوتے ہیں ہر زمانہ میں پاک دل پاک باز شخصیت کے حامل رہتے ہیں، خدا کے مقابلہ میں تعلقات کی زنجیر کو توڑ دیتے ہیں۔ آزادیٔ ضمیر کے حامل ہوتے ہیں، خدا سے عشق اور اس کے فرمان کی انجام دہی، اور معبود کی طرف راہنمائی کے علاوہ ان حضرات کے نزدیک کسی چیز

کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ۔ پاکیزگی ذہن و فکر سے پیدا ہونے والا عشق سوزاں، اصالت مکتب کا عقیدہ ان کو گناہوں سے اور بہت سی اخلاقی برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے ۔

بالفرض اگر بہت سے مقامات پر گناہ کے نقصانات ان کے پیش نظر نہ بھی ہوں پھر بھی ان کے دلوں میں حس اطاعت خداوندی اتنی پرشور و تحول انگیز و طاقتور ہے جو ان کے اور گناہوں کے درمیان سد سکندری بن جاتی ہے ۔ اور وہ اتنی استوار و مضبوط ہے کہ خواہشات اور ہوس آلود نفسانی تمایلات ان کو کسی بھی قیمت پر توڑ نہیں سکتے ۔

۲

محمد بن ابی عمیر کہتے ہیں : میں نے امام جعفر صادق (ع) کے ممتاز شاگرد ہشام سے پوچھا کہ کیا امام عصمت کا مالک ہوتا ہے ؟ یعنی کیا امام معصوم ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا ! ہاں ۔ میں نے پھر پوچھا کہ امام کی عصمت کس طرح کی ہوتی ہے ؟ ذرا وضاحت سے بتائیے ۔ انہوں نے فرمایا سنو : تمام رذائل اور گناہوں کا سبب چند چیزیں ہوا کرتی ہیں ، حرص ، حسد ، شہوت ، غضب ، اور یہ چیزیں امام کو متاثر نہیں کر سکتیں کیونکہ جس کے اختیار میں غیر محدود امکانات ہوں اور جس کے تصرف میں مسلمانوں کا بیت المال ہو وہ کبھی حریص نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح امام میں حسد نہیں ہو سکتا کیونکہ حاسد اپنے سے بلند پر حسد کرتا ہے اور امامت سے بلند کوئی مرتبہ ہی نہیں ہے تو امام حسد کس سے کریگا ؟ اب رہا غضب تو جب حدود الٰہی کا اجرا امام کے سپرد ہے تو وہ امور دنیا میں غصہ کرے گا نہیں بلکہ حد جاری کریگا ۔ اور اگر آخرت کے بارے میں غصہ کرتا ہے تو یہ پسندیدہ چیز ہے
اسی طرح امام شہوات و خواہشات کا اسیر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس دنیا کی لذتیں اور خواہشیں بہت جلد فنا ہونے والی ہیں

اور قیامت کے دن نعمات خداوندی صرف پاک اور حق پرست حضرات کے لئے مخصوص ہیں، ان نعمتوں کے مقابلہ میں دنیاوی نعمتیں بہت ہی ناچیز اور قابل قیاس بھی نہیں ہیں۔(۱)

(دیکھو) ارتکاب گناہ دو سبب سے ہو سکتا ہے:

(۱) گناہ کی برائی معلوم نہ ہو۔

(۲) شہوات کے مقابلے میں عقل کی طاقت وقدرت مغلوب ہو جائے۔

لہٰذا اگر کوئی تمام گناہوں کے مفاسد اور برائیوں سے واقف ہو۔ اور اپنی خواہشات پر بھر پور مسلط ہو کر انکو اپنے کنٹرول میں رکھ سکے تو پھر ایسے شخص کا گناہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

امام جعفر صادق (ع) فرماتے ہیں: خداوند عالم اپنے بندوں کے انتخاب وارادہ وتصمیم کے مطابق انکی یاری ومدد کرتا ہے۔ اس لئے اگر کسی کا انتخاب اور ارادہ درست وصحیح ہے تو خدا کی کامل امداد اس کو حاصل ہوتی ہے۔ اور جو شخص انتخاب میں کوتاہی کرتا ہے خدا کی مدد اسی نسبت سے کم ہوتی ہے۔ (۲)

یہاں تک تو بات عصمت انبیاء کی تھی کہ یہ حضرات معصوم ہوتے ہیں۔ اب اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی سنتے چلئے کہ ان سے کوئی اشتباہ بھی نہیں ہوتا اور اس کی علت یہ ہے کہ یہ حضرات جریان واقعیات کے حقائق کو جانتے ہیں اور اگر کوئی شخص ایک مخصوص حس کے ذریعہ ڈائریکٹ واقعیات کو دیکھ رہا ہے اور اس کے پیش نظر ہے تو پھر وہاں پر اشتباہ وخطا کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں ذہنی صورتوں کو خارجی واقعیات وحقائق سے تطبیق کرنا پڑتی ہے وہاں خطا اور اشتباہ کا امکان

۱۔ امالی صدوق ص ۳۷۶ ۔ ۲۔ بحار الانوار ج ۷۰ ص ۲۱۱

ہوتا ہے۔ اور جہاں انسان اندرونی طور سے واقعیتِ ہستی سے ارتباط پیدا کر لیتا ہے اس صورت میں اشتباہ کا ہونا محال ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہدایت و دعوت میں انکا انبیاء کے اندر لغزش و خطا نہیں ہوتی۔

اور اس صورت کے علاوہ تمام صورتوں میں آپ اخذِ پیامِ الٰہی میں ان کے جس دستور پر انگلی رکھیں گے شک و تردید ان کی باتوں میں ممکن ہے اور آپ حتمی طور پہنچ کر ان کے اتباع کے لئے آمادہ نہ پائیں گے۔

اس کے علاوہ جہاں تک دریافتِ پیام کا مسئلہ ہے تو تمام امور خداوند عالم کے اختیار میں ہیں وہاں شخصی نظریہ کی مداخلت کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ پروردگار کے بے پایاں علم و قدرت میں احتمالِ خطا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ مکمل نگرانی خدا کی طرف سے تبلیغ کی انجام دہی کے لئے ہے۔ جو ہر قسم کے خطا و اشتباہ کی نفی کرتی ہے۔ اور چونکہ دریافتِ فرامینِ الٰہی پروردگار کے زیر نگرانی ہوتی ہے لہٰذا تبلیغِ رسالت بھی اس خصوصیت سے بہرہ بردار ہوتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ فکر و سخن و عمل ہر ایک چیز میں عصمت رسولوں اور انبیاء کے لئے ضروری چیز ہے۔ اور خداوند عالم خطا کار اشخاص کے سپرد کارِ رسالت نہیں کر سکتا کیونکہ ایسے اشخاص مقصدِ رسالت ہی کو عقیم بنا دیں گے۔

اسی طرح انبیاء کے اندر جسمانی عیوب، روحانی نقائص کا نہ ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ چھوت کی بیماریاں، بدنام خاندان، تند خوئی، سخت مزاجی بھی انبیاء میں نہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ چیزیں باعثِ نفرت ہوتی ہیں اور لوگوں سے دوری و بے رغبتی کا سبب بنتی ہیں اور مقصدِ بعثت ـــ یعنی تربیت و انسان سازی ـــ کے نشر کرنے میں حارج ہوتی ہیں۔

چونکہ پیغمبر کی رسالت خدا کی طرف سے ہوتی ہے اس لئے اسکو ایسی تعلیمات پیش کرنا چاہیئے جو عقل کے قطعی اصول اور دانشِ بشری کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ پیغمبر کے رسالت کی نہ کوئی قدر و قیمت ہوگی نہ لوگ اس کا مطالعہ کرینگے اور نہ اس کی سچائی پر دلیل و معجزہ طلب کریں گے۔ احکام و اصول سے مراد وہ مسلم احکام اور عقلی قوانین ہیں جو مفروضات اور تھیوریوں کی چاردیواری میں اسیر نہ ہوں۔

انبیاء کی تعلیمات سے مراد وہ تشریعی نظام ہے جو خدا کی طرف سے آیا ہوا ہے اور نظامِ تکوین سے مراد مسائل و علمی قوانین ہیں اور ان دونوں نظاموں کا سرچشمہ ایک ہی ہے لہٰذا انکو اپنی ہم آہنگی کو ہر جگہ محفوظ رکھنا چاہیئے۔ یہ ناممکن ہے کہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رسول مسلماتِ عقلیہ کے خلاف تبلیغ کرتا ہو۔ کیونکہ جس خدا نے عقل کو حق و باطل کی تشخیص کے لئے معیار قرار دیا ہے وہ کوئی ایسا فرمان صادر نہیں کرسکتا جو عقل کے خلاف ہو۔

اسی طرح مقرراتِ آسمانی کے علم ــــ اس سے مراد وہ نظام ہے جس کو خدا نے اشیاء پر حاکم بنایا ہے ــــ کے مخالف ہونے کا سوال نہیں اٹھتا۔ بس اتنی بات ضرور ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ اگر مقصد تک رسائی کیلئے علم نے کوئی راستہ بتایا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ علمی راستہ منحصر بہ فرد ہے اور دیگر تمام راہیں مکمل طور سے بند ہیں۔ اور مقصد تک پہنچنے کا کوئی دوسرا راستہ ممکن نہیں ہے۔

بنابرایں جو مسائل علم کے خلاف ہوں ان میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور مذہبی مقررات کو علمی مسائل پر منطبق کرنے میں جلدبازی کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ علم آج کی دنیا میں ایک غیر محدود راستہ پر گامزن ہے اور یہ احتمال بہرحال موجود ہے کہ بعض اوقات علمی مسائل جامع تر اور وسیع تر تحقیقات کی بنا پر موردِ شک و تردید واقع ہوسکتے ہیں۔

رسولِ اسلام کی آمد

انبیائے ماسلف اپنی آسمانی کتابوں میں سرکار رسالتمآب کی کچھ خصوصیات اور آپ کی تولّد و قیام کی خوشخبری اپنے ماننے والوں کو پہلے ہی دے چکے تھے۔

جس وقت دنیا میں جہالت کا دور دورہ تھا، فرہنگی و اخلاقی پستی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ شرک و بت پرستی اپنے تمام خطرات کے ساتھ پوری کائنات کو اپنے آغوش میں لے چکی تھی، آسمانی مذاہب اگرچہ دنیا کے مختلف گوشوں میں تھے لیکن امتدادِ زمانہ اور تغییرِ ماہیت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ رہبری کی قدرت کھو بیٹھے تھے بلکہ ان کا بہتر سے بہتر نظام بھی پستی و انحطاط کی منزل تک پہونچ چکا تھا اور یہ امید ختم ہو چکی تھی کہ اس مردہ پیکر کے اندر کوئی روح پھونکی جا سکتی ہے اور اس کی سوکھی رگوں میں دوبارہ خون کی روانی ممکن ہو سکتی ہے۔

اسی لئے فرزانہ حضرات کسی عظیم انقلاب کے منتظر تھے کہ کوئی آسمانی شخصیت آئے اور مخلوق کے ہدایت و رہبری کے سنگین بوجھ کو اپنے مضبوط کاندھوں پر اٹھالے اور اس کو اس نظام پست سے بلند نظام تک پہونچا دے۔

ان حالات میں موعودِ نجات بخش حضرت محمد (ص) ۱۷ ربیع الاول سن ہجرت سے ۵۳ سال پہلے مطابق ۵۷۰ عیسوی، جزیرۃ العرب کے ایک پست و پرورشنگو جہل والے شہر مکہ میں جمعہ کے دن بوقت سحر اس سرزمین پر متولد ہوئے اور افقِ بشریت پر روشن ستارہ بن کے چمکے۔

تاریخ کہتی ہے یہ مولود مسعود حضرت آمنہ کے بطن سے پیدا ہوا اور بہت کم مدت میں کائنات پر چھا گیا۔ اور ایک بہترین ناقابل ترمیم نظام کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

آپ کی تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ بت پرستی کی جگہ توحید و یکتا پرستی، جہل و نادانی کی جگہ علم و دانش، دشمنی و کینہ توزی و اختلافات کی جگہ برادری، مہربانی، انسان دوستی اور اتحاد و اتفاق نے لے لی۔ اور انجام کار فساد و جہل کا پرورش یافتہ معاشرہ ممتاز ترین سماج کی صورت میں ظاہر ہوا۔

آپ کے والد بزرگوار جناب عبداللہ جو نسل اسماعیل سے تھے حضرت محمد (ص) کی ولادت سے پہلے اس دنیا سے رحلت فرما گئے (۱) اور ابھی آپ نے عمر کی چھ منزلیں بھی مکمل نہ کی تھیں کہ جناب آمنہ جو آپ کی والدہ تھیں اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔ (۲)

جناب آمنہ کے انتقال کے بعد حضرت عبدالمطلب اپنی زندگی بھر آپ کی کفالت کرتے رہے۔ لیکن ابھی جناب رسول خدا (ص) کی عمر آٹھ سال کی تھی کہ حضرت عبدالمطلب کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور ماں کے صدمہ کے بعد دادا کا انتقال مزید رنج و غم کا سبب بنا۔

لیکن قدرت کی عنایت کی وجہ سے آپ کو ان مصائب کے تحمل کی برداشت تھی کیونکہ جس یتیم کو انسانیت کا باپ بننا ہے اور دنیا کے تمام درد مندوں اور مصیبت زدہ لوگوں کی غمخواری کرنا ہے اس کے لئے بچپنے سے ہی محنتوں اور محرومیوں سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ اور پہاڑ جیسی سخت و مضبوط روح کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۱ ۲۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۹

تاکہ طاقت فرسا رسالتِ الٰہی کے بار کو اپنے کندھوں پر اٹھا سکے۔ کیونکہ یہی بلند روح دشواریوں اور موانع کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

جناب عبدالمطلب کے بعد آپ کے حقیقی چچا جناب حضرت ابوطالب(ع) نے آپ کی سرپرستی کا بیڑا اٹھایا۔ (۱) تاریخ نویسوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ایک آسمانی بزرگ و رہبر کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب آنحضرت (ص) کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

کوئی محقق یہ نہیں ثابت کر سکا کہ پوری زندگی میں حضور(ص) نے کبھی ایک معمولی اخلاقی یا روحی انحراف کا بھی ارتکاب کیا ہو۔ حالانکہ تاریخ بشر میں جو لوگ بھی دور یا نزدیک سے امتیاز ہوئے ہیں ان سب میں آنحضرت(ص) کے خصائص روشن تر و گویا تر تھے۔ اس کے باوجود پوری تاریخ میں معمولی سی سرکشی، بدخوئی، طغیان ناپسندیدہ رفتار، انتہا یہ ہے کہ ایک بار کی بھی لغزش کا کوئی شخص ثبوت پیش نہیں کر سکا۔

"تاریخ کے اندر مسلمانوں کے پیشوا کے پورے حالات روشن ہیں۔ ولادت سے پہلے کے حالات، بچپنے، جوانی کے حالات، آداب، اخلاق، مسافرت، شادی بیاہ، صلح و جنگ یہ سب حالات تاریخ میں موجود ہیں مگر شمہ برابر کی کوئی نہیں نکال سکا۔

تاریخ مستند گواہ ہے کہ فاسد عقائد کی تاریکیوں اور طوفان کا آپ کے تابناک انسانی چہرہ پر کوئی اثر و نشان نہیں تھا۔ حالانکہ آپ نے اس دنیا میں کسی سے نہ تعلیم حاصل کی تھی نہ تربیت۔ لیکن پھر بھی آپ کا جاہلیت سے کوئی ربط نہیں تھا

۱۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۰

اور آپ کے اندر کوئی بُری خصلت موجود نہیں تھی۔

آپ نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی وہ شرک و بت پرستی اور دعوتِ توحید کے مقابلے میں بدو عرب کی شدید مقاومت سے پُر تھا۔ آپ کی پوری زندگی ایک جاہل و بدکردار و ستمگر قوم کے درمیان گزری اور بعثت سے پہلے آپ کی پوری زندگی اسی معاشرہ میں گذری صرف دو مختصر سفر میں آپ جزیرۃ العرب سے باہر نکلے ہیں۔ پہلی مرتبہ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ جبکہ آپکی عمر کی دوسری دہائی کی ابتدا ہی تھی اور دوسری مرتبہ جناب خدیجہ کی تجارت کیلئے جب آپکی عمر کی تیسری دھائی تقریباً آدھی گزر چکی تھی ـــ اس کے علاوہ آپ اس ماحول سے باہر نہیں نکلے لیکن اس کے باوجود آپ کی شخصیت اور معاشرے کے ماحول میں کوئی بھی مناسبت نہیں پائی جاتی۔

اس پر فساد ماحول میں سچائی، امانت داری، عدالت، روحانیت آپ کے یہاں بدرجہ کمال تو تھی ہی آپ بشریت کی تمام خامیوں سے نہ صرف پاک تھے بلکہ ان کے شدید مخالف تھے۔

پرمعنی و عمیق گفتگو، مبنی بر انصاف فیصلے، عقل و درایت کی برتری، بنیادِ آسمانی، فکرِ درخشاں آپکے وجود میں ہر جگہ نمایاں و ظاہر تھی۔ اور آپ کی زندگی ایسی گذری کہ اعلانِ پیغمبری سے پہلے ہی آپ کے دشمن آپ کو "امین" کے لقب سے موسوم کر چکے تھے۔ جو آپ کے راہ و روش پر روشن دلیل ہے۔(۱)

۞

اکثر اوقات آپ کا جسمانی اور عقلی رشد و کمال آپ کو خلوت نشینی پر مجبور

۱۔ تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۱۳۸

کردیتا تھا۔ ماحول کی شدید ناسازگاری، افکار کی گہرائی آپ کو خلوت نشینی پر آمادہ کرتی تھی۔

موجودات میں غور و فکر کی جلد بازی، نفسانی خواہش اور شخصی دریافت نہیں تھی بلکہ نظامِ شگفتِ ہستی میں گہرے ارادہ و اختیار کے ہاتھ نے کتابِ طبیعت کے صفحات پر جو قلم لگایا ہے اس کو بخوبی دیکھتے تھے۔ اور یہ آپ کی ژرف اندیشی تھی۔

ماہِ رمضان میں تنہا مکہ کے اطراف جو غار ہیں ان میں جاکر تاریکی و سکوت سے استفادہ فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگوں اور معاشرہ کی آلودگیوں سے الگ رہ کر عبادتِ الٰہی کی عادت ڈالیں اور آپ کی عبادتوں اور خضوع و خشوع اور افکار سے جلالِ پروردگارِ عالم ہویدا تھا۔

آپکے پر سکون چہرے سے عشقِ الٰہی کی موج اٹھتی تھی اور اپنی قوم کی شرک و حماقت سے رنجیدہ رہتے تھے کہ آخر یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ سے بت تراشتے ہیں پھر انہیں بتوں کی عبادت کرتے ہیں - اور محنت و مشقت برداشت کرتے ہیں۔

زندگی کا جتنا حصہ گزرتا جاتا تھا اتنا ہی آپ کا احساس بھی بڑھتا جارہا تھا جب آپ چالیس سال کے قریب ہو گئے تو آپ کے گفتار و رفتار سے نگرانی کا احساس مزید شدید ہو گیا۔ اور اپنی شریکِ زندگی کو ان آوازوں سے مطلع فرماتے رہتے تھے جو مسلسل آپ کے کانوں میں آیا کرتی تھیں۔ اور اس خیرہ کرنے والی روشنی سے بھی جو آپکے وجود کو گھیرے رہتی تھی، اپنی اہلیہ کو مطلع فرمایا کرتے تھے۔

اس طرح سے سرکار کا بچپنا گزرا۔ اختصار مدِ نظر نہ ہوتا تو مزید حالات

پر روشنی ڈالی جاتی ۔ اور جب یہ زمانہ گذر گیا اور آپ نے زندگی کی چالیس دور
دیکھ لئے تو آپ کو اعلانِ رسالت کرنے کا حکم دیا گیا ۔

آغازِ بعثت

آخر وہ وقت آہی گیا جس کی خوشخبری انبیاء نے اپنی امتوں کو دی تھی اور یتیم عبدالمطلب نے چالیس سال کی عمر میں رسالتِ آسمانی کا اعلان کردیا۔

سرکارِ دو عالم غارِ حرا کے ایک گوشہ میں محوِ عبادت تھے ناگاہ رات کے وقت اس شخص نے ــــ جس نے دنیا میں نہ کسی مکتب میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا ــــ ایک آواز یا محمد کی سُنی اور نغمۂ اِقْرَءْ کی صدا جو آغاز وحی تھا، نے آپ کو آمادہ کردیا۔ بیکراں اوقیانوس الوہیت سے ایک موج اٹھی جو حیرت زدہ محمد کے سینہ میں داخل ہوگئی اور آپ کے دل کو انوار سے پُر کردیا۔

اس کے بعد اس درد انگیز جذبہ کے ساتھ جس کو آپ نے دل کی گہرائی میں محسوس کیا تھا اور سنگین ترین بارِ مسؤلیت کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے حرا سے گھر کی جانب روانہ ہوئے تاکہ تمام انسانوں کے معلم بن جائیں۔ اور بشریت کی رہبری کا عہدہ سنبھالیں۔

اور اس کے بعد تو پھر لگاتار جبرئیل کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ جبرئیل آتے تھے اور آیات کی تلاوت کرتے تھے اور وہ آیات اتنی عمیق و حیرت زا ہوتی تھیں کہ ترکیب کلمات کے لحاظ سے اور مفاہیم شگفت کے اعتبار سے نہ تو رسول اکرم کی سنجیدہ گفتگو سے مشابہت رکھتی تھیں اور نہ اس زمانہ کے سخنوروں کے نثر سے

اور شعراء کے اشعار سے کوئی مطابقت رکھتی تھیں۔

زمانۂ جاہلیت کے عرب نہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور نہ ہی ان میں مورخ و فیلسوف و دانشمند ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بہترین قسم کے اشعار کہنے اور پڑھنے میں مشہور تھے۔ مگر رسولؐ اکرم بعثت سے پہلے بھی محفل شعرو سخنوری میں کبھی شرکت نہیں کرتے تھے۔

رسولخدا (ص) کی سیرت اور قرآن مجید دونوں گواہ ہیں کہ تبلیغ کے سلسلہ میں کسی قسم کا لحاظ نہیں برتتے تھے بلکہ واضح طریقہ سے لوگوں کے عقائد و خواہشات اور اپنے مصالح کے بھی خلاف احکام الٰہی کے پہونچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ اور شریر و جاہل و تباہ گشتہ و مسخ شدہ ملت کو خود ساختہ بتوں کی عبادت سے الگ کر کے خدا کی عبادت و یکتائی کی طرف رہنمائی فرماتے تھے۔

اس تبلیغ کا سبب اور بے مثال فعالیت کی عمر کے تیسرے حصہ میں ابتدا کی علت اور تمام نیکیوں کا سرچشمہ اور خیرات کا مرکز بن جانے کی وجہ آسمانی رسالت کے احکام کے پہونچانے پر وحی کا آنا تھا۔ نزول وحی سے پہلے عالمی پیمانہ پر انقلاب لانے کے مقدمات آپ میں مشاہدہ نہیں کئے گئے۔

یقیناً جس چیز نے محمدؐ کی شخصیت کو متاثر کیا اور کل کے افکار و خیالات کو انقلاب سے بدل دیا۔ اور عرب کی تہ در تہ تاریکی کو بدلنے کا خیال پیدا کیا اور دنیا نے بشریت میں عمیق انقلاب پیدا کیا وہ صرف وحی کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں تھی۔ یعنی وہی آواز جو دل کی گہرائی تک اتر جایا کرتی تھی اور ہڈیوں کے گودے کو پگھلا دیتی تھی۔

لوگوں کے نظروں میں جو خوبیوں کا معیار تھا۔ اور باطل جو حق کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا اور اسی کو انسانی اقدار و اخلاق کا واحد معیار سمجھا جاتا تھا وحی نے ان

سب کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ۔ اور اس کے بعد میں نئے اور روشن مقیاس جو منزل کمال تک پہونچانے والے تھے اور انسان کی ترقی کے اسباب تھے انکو قائم مقام بنایا بے خبری و سکوت کے تاروں کو پارہ پارہ کر دیا ۔ آدمی کی طاقت کو متحرک کر دیا ۔ انسان کے باطن میں افکار کی قدرت کو برانگیختہ کیا ۔ اور اس کی روحانیت کو غیر متناہی بلندی تک پہونچا دیا ۔

رسول اکرمؐ نے ایک کائناتی رہبر و شعار توحید کے ساتھ سب سے پہلے اپنی تبلیغ کی ابتدا ایک محدود دائرہ اور ایک ایسے معاشرہ کے اندر فرمائی جس میں قبائلی سرشت بہت سخت تھی اور موجودات میں بت کو مقدس ترین اور محبوب ترین چیز سمجھا جاتا تھا اور وہ معاشرہ قبولیت توحید پر کسی طرح آمادہ ہی نہیں تھا ۔

اسلام کے آداب و رسوم نہ صرف بت پرست معاشرہ سے عظیم تھے بلکہ اس وقت کے تمام مذاہب کے آداب و رسوم سے بالاتر تھے ۔

اندیشہ و افکار کی اصلاح کا پروگرام اور خطاؤں اور انحرافات کی اصلاح ایک ایسے انسان کے ہاتھ سے ہوئی جو دنیا میں پڑھا نہ تھا جس کو دنیا " اُمّی " کہتی تھی اور جو مذہبی کتابوں اور اپنے زمانہ کے تمدن سے ناواقف تھا ۔

رسولؐ نے سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا کی عبادت کی طرف بلایا اس کے بعد مکہ والوں کو اور پھر جزیرۂ عربستان کو دنیا کے آخری نبی ہونے کے عنوان سے دعوت دی تھی ۔

سب سے پہلے جس نے رسولؐ کے پیغام کو قبول کیا وہ حضرت علیؑ بن ابیطالب[1]

۱۔ مروج الذہب ج ۱ ص ۴۰

کی ذات گرامی اور حضرت خدیجہ (رسول خدا کی بیوی) کی ذات مبارک تھی اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگ ایمان لاتے رہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: ایک دن آنحضرتؐ نے اپنے قرابت داروں کو بلایا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے اولادِ عبدالمطلب میں تمہارے لئے جو لے کر آیا ہوں جزیرۂ عرب میں اس سے بہتر اب تک کوئی نہیں لایا۔ میں دنیا و آخرت کی نیکیوں کو تمہارے لئے بطور تحفہ لایا ہوں۔ اور حکم خدا ہے کہ تم کو اس کی طرف بلاؤں تم میں سے کون ایسا ہے جو میری مدد کرے تاکہ وہ تمہارے درمیان میرا بھائی اور میرا خلیفہ اور میرا وصی ہو؟ —— یہ صدا سنکر سب خاموش رہے اور میں جو ان سب میں سب سے زیادہ کمسن تھا بولا: اے خدا کے رسولؐ میں آپ کی مدد کروں گا۔ رسول خداؐ نے فرمایا: یہ تمہارے درمیان میرا بھائی، میرا خلیفہ اور میرا وصی ہے اسکی باتوں کو سنو اور قبول کرو۔ (۱)

۵

رسولؐ اسلام نے اپنی فوق العادہ قدرت رہبری، سیاسی پختگی کے ساتھ انسان کے باطن کی سازندگی شروع کردی۔ اور فطری توحید و اسرار کائنات میں مطالعہ و دقت کے ذریعہ بشر کو غیر محدود ہستی سے آشنا کرایا۔ جس وقت لوگ اپنی کوتاہ فکری کی وجہ سے قبیلوں کی تقسیم بندی، فخر و مباہات اور معاشرہ کے خود ساختہ امتیازات، اقدار، غیر معقول تعصب میں مبتلا تھے اس وقت آپ نے قیام فرمایا اور تمام خود ساختہ امتیازات کو ختم کرکے زندگی کے عمل اور باہمی روابط کے بارے میں جدید مفاہیم کو احکام و مقررات کے ایک رشتہ میں

۱۔ تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۱۷۲

منسلک کر کے ایک انسانی ساز پروگرام پیش فرمایا۔ اور پھر کوشش کر کے تمام مقاصد وافکار کو ایک مرکزیت عطا کی۔ تاکہ قوموں کو غلامی سے آزاد کرایا جائے اور مظلوموں کی ظالموں کے پنجوں سے رہائی اور قیصر و کسریٰ کی زبردستیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جاسکے۔

حضور نے جو احکام و دستور پیش کیئے ہیں ان کے عالی ترین اور نفیس ترین ہونے کا اقرار ان لوگوں کو بھی ہے جو ان احکامات کو آسمانی نہیں مانتے۔

۵

تین سال تک آپ پوشیدہ طریقہ سے تبلیغ فرماتے رہے۔ اور مخفی طریقہ سے اسلام کی ترقی میں کوشاں تھے۔ اور تیرہ سال تک آپ کی رسالت کا مرکز مکہ تھا۔ اس مدت میں مشرکین کے سرداروں نے حالات کا اندازہ لگا لیا تھا لہٰذا انہوں نے اپنے زمانۂ جاہلیت کے عقائد و رسوم کی حفاظت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اسلام کی صدائے آزادی بخش کو خاموش کرنے میں زبردست مخالفت کی اور نومسلموں کے ساتھ ایسے ایسے وحشی قسم کے مظالم کیئے کہ مورخ کا قلم لکھتے ہوئے لرزنے لگتا ہے۔

جو لوگ تازہ مسلمان ہوئے تھے انکو اس جرم میں قید کر دیتے تھے اور اسلام لانے کے جرم میں انکو بھوکا پیاسا رکھ کر مکہ کی جلتی ہوئی زمین پر لٹا کر جلتے ہوئے وزنی پتھر انکے سینہ اور پشت پر رکھ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ محمدؐ کے دین سے باز آجاؤ!

جناب عمار کے والدین یاسر و سمیہ کو وحشی ترین شکنجوں میں کس دیا کرتے تھے۔ روزانہ جب آفتاب نصف النہار پر پہونچ جاتا تھا اور مکہ کی پتھریلی زمین آگ اگلنے لگتی تھی اور سورج آتش باری کرنے لگتا تھا انکو عریاں جلتی ہوئی زمین پر لٹا کر بہت ہی وزنی پتھر ان کے سینوں پر رکھ دیا کرتے اور یہ دونوں برداشت کرتے

سے تھے مگر کب تک ؟ آخر ایک دن انہوں نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی اور یہ اسلام میں سب سے پہلے شہید ہیں ۔ جناب یاسر تو ترشکنجوں کی تاب نہ لاکر شہید ہوئے اور جناب سمیہ ابوجہل کے ہاتھوں درجہ شہادت پر فائز ہوئیں ۔(۱)

مشرکین اس قسم کے مظالم کرکے اسلام کو پھیلنے پھولنے سے پہلے ہی ختم کردینا چاہتے تھے کیونکہ اگر پیغمبرؐ کی دعوت عام ہوجاتی تو ہمیشہ کے لئے ان کی حاکمیت کا جنازہ نکل جاتا اور فرسودہ امتیازات ختم ہوجاتے حسد بھی ایک عظیم مؤثر اس سلسلہ میں ثابت ہوا۔

اس ظلم وستم کا بازار اتنا گرم ہوا کہ شہر مکہ بے پناہ مسلمانوں کیلئے ایک شکنجہ گاہ بن گیا ۔ مشرکین کی طرف سے آیات قرآنی کے سننے پر سخت ترین پابندیاں عائد کردی گئیں ۔ ایک جماعت کو صرف اس کام پر معین کردیا گیا کہ باہر سے مکہ میں آنے والے قافلوں کو خطرہ سے آگاہ کریں اور انکو مسلمانوں سے ملنے نہ دیں ۔

بہت سے مسلمانوں نے قریش کی سختیوں سے بچنے کے لئے اور سکون و آرام کی جگہ حاصل کرنے اور وہاں پر شعائر اسلامی کے نشر کرنے کیلئے اور خدائے یکتا کی عبادت اور کفار کے مظالم سے نجات حاصل کرنے کے لئے مجبوراً مکہ کو چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے ـــــ لیکن مخالفین نے وہاں بھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑا اور دو آدمیوں کو بادشاہ حبشہ کے پاس اسلئے بھیجا کہ مسلمانوں کو واپس ہمارے پاس بھیجدو ۔ لیکن نجاشی (بادشاہ حبشہ) نے مسلمانوں کی پذیرائی کی اور اپنے دامن حمایت میں پناہ دی ۔ اسی وجہ سے مسلمان آزادی کے ساتھ سرزمین حبشہ میں وظائف اسلامی کی نشر واشاعت کرنے لگے اور ادھر قریش کے

۱۔ سیرۂ حلبی ص ۳۲۳

نمائندے نجاشی کے پاس تحفہ و تحائف کا انبار لے کر پہنچے اور ضرورت سے زیادہ اصرار کیا کہ ان کو ہمارے حوالے کردو ! نجاشی نے کہا ان لوگوں نے تمام بادشاہوں کو چھوڑ کر میرا انتخاب کیا ہے میں جب تک باقاعدہ ان کے بارے میں تحقیق نہ کرلوں گا ان کو اپنی زمین سے نہیں نکالونگا !

نجاشی نے جب تحقیق حال کیا اور جناب جعفر بن ابی طالب کی دلنشین گفتگو سنی اور مہاجرین کے عقائد حضرت عیسیٰ کے بارے میں سنے تو بہت زیادہ متاثر ہوا ۔ اور بولا : خدا کی قسم عیسیٰ کا اس سے زیادہ درجہ نہ تھا لیکن نجاشی کے منحرف وزیروں کو نجاشی کی یہ بات اچھی نہیں لگی ، مگر نجاشی نے اس کے باوجود مسلمانوں کے عقائد کی تحسین کی اور ان کو مکمل آزادی دیدی اور قریش کے تحفے تحائف کو ان کے سامنے اٹھا کر پھینکدیا اور کہنے لگا : خدا نے جس وقت مجھے یہ قدرت و بادشاہی بخشی ہے مجھ سے کسی قسم کی رشوت نہیں لی ۔ لہٰذا یہ نہایت نامناسب بات ہے کہ میں اپنے رزق کا سہارا رشوت پر رکھوں (۱)

اسطرح دوبارہ نور کا غلبہ تاریکی پر ہوا اور شرک و جہالت کے عوامل مایوس ہو کر حبشہ سے شکست خوردہ واپس آ گئے ۔

(۱) سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۳۳۸

دشمنوں کے حربے

دشمنانِ اسلام نے جب دیکھا کہ نظامِ توحید کے مقابلے میں ہماری حکومت متزلزل ہو رہی ہے اور ہر بت خواہ طبیعی ہو یا اجتماعی، ذہنی ہو یا عینی وہ توحید کے تیر سے ٹوٹ جائیگا تو پہلے ان لوگوں نے ڈرانے دھمکانے سے کام لیا لیکن جب اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو وعدہ، لالچ اور تزویر کے ذریعہ کام لینا چاہا اور رسولِ اکرم کو ہر قسم کا امتیاز دینے کیلئے تیار ہو گئے کہ آپ جس راہ پر چل رہے ہیں اس سے باز آجائیں۔

مگر ان کی یہ ساری کوششیں رائیگاں ہو گئیں اور آپ نے حکومت، فرمانروائی، آسائش و آرام، ثروت و دولت کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے رسالتِ آسمانی کے سلسلہ میں اپنا حتمی اور آخری فیصلہ سنا دیا:

خدا کی قسم اگر میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں ماہتاب رکھ دیا جائے جب بھی میں اپنے فریضہ سے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا جب تک کہ روئے زمین پر دینِ خدا منتشر نہ ہو جائے یا میں اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں۔ (۱)

یعقوبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے: قریش حضرت ابو طالب کی خدمت میں آکر عرض پرداز ہوئے کہ آپ کا بھتیجا ہمارے خداؤں کو برائی سے یاد کرتا ہے

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۷۸

اور ہم لوگوں کو دیوانہ سمجھتا ہے ۔ ہمارے بزرگوں کو گمراہ کہتا ہے آپ ان سے کہیئے کہ اپنی دعوت سے باز آجائیں تو ہم اپنے اموال کو ان کے اختیار میں دینے کے لئے تیار ہیں پیغمبر خدا (ص) نے جواباً کہا : خدا نے مجھے اس لئے مبعوث نہیں کیا ہے کہ مال دنیا کو جمع کروں اور لوگوں کو محبتِ دنیا کی طرف دعوت دوں ۔ بلکہ خدا نے مجھے دعوتِ اسلام کو عام کرنے کے لئے اور لوگوں کو اسکی طرف بلانے کے لئے مبعوث کیا ہے ۔ (۱)

جب دشمنوں نے یہ دیکھ لیا کہ آپ کسی طرح بھی ماننے والے نہیں ہیں ، تو انہوں نے دوسرا پروگرام بنایا اور اسلامی لہر کے خلاف ہر قسم کے ہتھکنڈے مہیا کرنے لگے اور یہ طے کر لیا کہ کسی بھی طرح اس نئے دین کو ترقی حاصل کرنے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہیئے ۔

جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے ، انہوں نے آپس میں میل جول پیدا کیا تاکہ پرچم اسلام کو سرنگون کر سکیں ۔ اور ان کی ساری کوشش اس بات پر ہونے لگی کہ سرکارِ دو عالم کے حسنِ شہرت اور حضور کی سابق روشن زندگی کو داغدار کریں ۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اپنے اندرونی کینہ توزی کو فراموش کر دیں ۔

چنانچہ سب نے مل کر ہر جگہ یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ محمد (ص) ساحر ہیں ، دیوانہ ہیں ، شاعر ہیں ، اور اس کے ساتھ ساتھ جاہلوں کو آپ کے خلاف ورغلایا اور یہ وہی پرانا شیطانی طریقہ ہے کہ دشمن بزرگ شخصیتوں کے ساتھ کرتے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ باقی ہے ۔

۱۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۷

خود قرآن اس شیطانی طریقے کو عصر رسول اکرم (ص) سے مخصوص نہیں سمجھتا اور لوگوں کو خبر دیتے ہوئے اعلان کرتا ہے:

پہلی امتوں میں کوئی ایسا نبی نہیں بھیجا گیا جس کے بارے میں ان لوگوں نے جادوگر یا دیوانہ نہ کہا ہو، کیا یہ لوگ ایک دوسرے کو ایسی بات کی وصیت کرتے آئے ہیں؟ (نہیں) بلکہ یہ لوگ ہی سرکش ہیں۔ (۱)

لیکن ان حضرات نے دشمنوں سے کوئی پرخاش نہیں رکھی بلکہ دشمنوں کے تعصب کوتاہ بینی۔ بزرگوں کی سیرت کے مطابق اذیت پہنچانا، پتھر مارنا، ______

اگرچہ یہ باتیں انبیاء کی زحمتوں کو بڑھا دیتی تھیں ______ مگر اس کے باوجود ان دشمنوں سے غضبناک نہیں ہوتے تھے بلکہ کوشش کرتے تھے کہ معنوی تعلیمات کے ذریعہ ان کو واقع بینی کی طرف آمادہ کریں۔

۵

طمع، دباؤ، محرومیت، آوارگی نے رسول (ص) کے ارادہ میں کوئی تزلزل نہیں پیدا کیا۔ اسی طرح بے بنیاد و اذیت دہ اتہامات کی تشہیر نے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ کیونکہ وحی کی منطق گیری اور قرآن کی صدا ایسی نہیں تھی کہ سننے والے کے دل و جان کو بے اثر چھوڑ دے اور اس کو مجذوب و دگرگون نہ کردے۔ بلکہ کبھی کبھی دشمن بھی اعتراف حقیقت پر مجبور ہو جاتے تھے جیسا کہ ابوجہل نے ولید سے کہا: قرآن کے بارے میں اپنا نظریہ بتاؤ؟ ولید نے کہا: میں کیا عرض کروں۔ خدا کی قسم تم میں سے کوئی بھی اشعار عرب کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتا اور نہ ہی فنون شعر کے احاطہ میں کوئی شخص تم میں سے میرے

۱۔ سورۂ ذاریات آیت ۵۱ - ۵۲

برابر ہے خواہ وہ رجز ہو یا قصیدہ یا دوسرے اقسام شعر! ــــــ لیکن خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ قرآن میں ایک مخصوص قسم کی حلاوت و شیرینی ہے جو تمام اصنافِ سخن سے بالا ہے اور اس سے بالاتر سخن میرے علم میں نہیں ہے۔

ابو جہل نے اصرار کیا اور کہا کہ قریش تم کو چھوڑینگے نہیں جب تک تم محمد (ص) کے قرآن کے بارے میں فیصلہ نہ کردو! ولید نے مہلت مانگی اور ایک مدت تک غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا:

محمد (ص) کا قرآن ایک جادو ہے جو ساحروں سے ان کو پہونچا ہے (۱)

حالانکہ رسول خدا (ص) بہت صابر تھے اور آپ کی قوتِ برداشت بے انتہا تھی لیکن کبھی کبھی اپنی قوم کی ابلہانہ رفتار سے دلگیر ہو جایا کرتے تھے، اور تنہائی اختیار کر لیتے تھے مگر فرمانِ الٰہی ان کو ان کی عظیم مسؤلیت کیطرف دعوت دیتا تھا کہ جن مقدس اہداف کو اپنے ذمہ لیا ہے اسکی راہ میں ایک لحظہ توقف بھی جائز نہیں ہے۔ آپکو آرام و تنہائی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

انبیائے کرام کی نہضت کی کامیابی کی ایک وجہ علم و بردباری بھی تھی خود قرآن سیرتِ انبیاء اور ان کی تحریک ان کی پے در پے شکست، ناکامیوں، شکنجوں، سختیوں سے اپنے آخری رسول کو ہوشیار بھی کرتا رہا ہے۔

اسماعیل، ادریس، ذوالکفل، اپنی رسالت کے انجام دینے میں بہت ہی بردبار تھے۔ یقیناً سفیرانِ الٰہی نے مسلسل انکار، تکذیب، شکنجوں کو برداشت کیا اور ثابت قدم رہے کہ آخر کار نصرتِ الٰہی ان کے شامل حال ہو گئی۔

۱۔ تفسیر طبری ج ۲۹ ص ۹۸

آغازِ ہجرت

مکہ کا خطرناک ماحول، بے حساب تاریکی اور مسلمانوں کا شکنجوں میں گرفتار ہونا، مزا گرفتار ہونا ایک ایسی تکلیف دہ بات تھی کہ مسلمان اس کو کب تک برداشت کرتے؛ جبکہ مجاہدین اسلام میں ابھی مقابلہ کی طاقت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آخر کار ہجرت کا حکم آیا اور رسول اکرم (ص) نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ الگ الگ منتشر ہو کر مکہ کو خیر باد کہیں اور یثرب (مدینہ) کی طرف ہجرت کر جائیں۔

ادھر قریش نے بھی خطرہ کی بو سونگھ لی اور نو مسلموں کے ساتھ ہر نازیبا سلوک پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن مسلمانوں نے جو طے کر لیا تھا اس سے پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پا لگاہِ شرک و جہل و ستم کو ترک کرنے وا اپنے وابستگی کے سامان کو چھوڑنے، اپنے خاندان کو خیرباد کہنے پر آمادہ ہو گئے اور مکہ سے ہجرت شروع کر دی اور یثرب کے لوگوں نے ترکِ وطن کر کے آنیوالوں کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہی۔

مسلمانوں کی اکثریت مکہ چھوڑ کر چلی گئی اور در حقیقت مکہ خالی ہو گیا اور ادھر مدینہ سے آنے والی خبروں نے قریش کو خوفزدہ کر دیا اور گہری فکر پر آمادہ کر دیا۔

کفر و الحاد کے سرداروں نے جب یہ دیکھ لیا کہ ان کی ساری تدبیریں بے کار ہو گئیں تو انہوں نے ایک آخری اور یقینی تدبیر پر اتفاق رائے کر لیا کہ جب رات کا دامن وسیع ہو جائے تو تاریکی شب میں خدا کے نور کو بجھا دیا جائے۔ (سیرۂ ابن ہشام ج ۱ ص ۴۸۰)

چنانچہ ان لوگوں نے رات کو رسول ؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ محمد ؐ جب علی الصباح گھر سے نکلیں تو انکو قتل کر دیا جائے ۔ پوری رات آپکے گھر کے کو نظروں میں رکھا اور یہ انکو پہلے ہی سے اطمینان تھا کہ فرزند عبداللہ کا پورے شہر میں کوئی ناصر و مددگار نہیں ہے لہٰذا وہ ہمارے محاصرے سے زندہ و سلامت نہیں جا سکتے اور صبح کے وقت قصہ تمام ہو جائے گا ۔

لیکن رسول خدا ؐ نے ادھر حضرت علی ؑ کو حکم دیا کہ میرے بستر پر سو جاؤ اور آپ گھر سے باہر چلے گئے اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے ان جوانوں سے جو محمد (ص) کے خون کے پیاسے تھے پوچھا : کس کے انتظار میں ہو ؟ ان لوگوں نے کہا : محمد (ص) کا انتظار کر رہے ہیں ! اس نے کہا وہ تمہارے چنگل سے نکل گئے ، اور واقعاً جب صبح صادق نے افق کے سینہ کو چاک کیا تو ان کی آنکھوں نے بڑی حسرت و یاس سے یہ منظر دیکھا کہ علی (ع) پیغمبرؐ کے بستر سے اٹھے ۔

اب رہی یہ بات کہ پیغمبر ؐ نے محاصرہ کو کس طرح توڑا کسی کو خبر نہ ہو سکی صحیح طور پر معلوم نہیں ہے لیکن اتنی بات بہرحال مسلّم ہے کہ خدا نے خود چاہا کہ اس کا رسول (ص) فرومایہ لوگوں کے چنگل سے نکل جائے ۔

رسول (ص) نے راتوں رات مکہ کو چھوڑا اور ایک غار میں پناہ گزین ہو گئے اور غیر معروف راستوں سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے اور ایک بار خدا نے پھر دکھا دیا کہ جس نے محمد ؐ کو تیرہ سال حوادث سے بچایا تھا وہ قریش کے خائنانہ طریقوں سے پھر اپنے نبی کو بچا سکتا ہے ۔ اور ان کے اقدامات کو نقش بر آب کر سکتا ہے اور اس طرح قریش کی تدبیر خود انہیں کے خلاف ہو گئی ۔

۵

مدینہ کے سرداروں کا ایک گروہ ہجرت سے پہلے مراسم حج ادا کرنے کیلئے

مکہ آیا تھا اور اس گروہ نے رسول (ص) کی دعوت پر اسلام قبول کر لیا تھا ۔ یہ گروہ جب مکہ سے اپنے وطن واپس آیا تو لوگوں کو تلاش کر کر کے پیغام الٰہی پہنچانا شروع کر دیا اور حکومت بت پرستی پر یہ بہت بڑی کاری ضرب تھی ۔۔۔ اس دعوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ کے لوگ جو قبائلی جنگوں سے تنگ آچکے تھے اور فرسودہ نظام کو چھوڑنا چاہتے تھے اسلام کی دعوت کو اس خانمان سوز آتش سے نجات کا مژدہ قرار دیا اور اچھے خاصے لوگ مسلمان ہو گئے ۔

جب تک اس زمانہ میں جزیرۃ العرب کی کیا حالت تھی اس کو بخوبی نہ سمجھ لیں تو نہ اسلام کے عظیم انقلاب کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ احساس کر سکتے ہیں کہ گمراہی و فساد کے دور کرنے میں اسلام نے کیا اثر کیا ہے ۔

حضرت علی (ع) فرماتے ہیں : خدا نے حضرت محمد (ص) کو اس لئے بھیجا تاکہ دنیا والوں نے جو (باطل) راہ و رسم اختیار کر رکھی ہے اس سے ڈرائیں اور حضرت کو اپنے آسمانی دستور کا امین بنایا ۔ اور اے گروہ عرب تم لوگ اس وقت بدترین دین کے گرویدہ تھے اور محروم ترین زمین پر زندگی بسر کر رہے تھے سنگلاخ زمینوں اور ڈسنے والے سانپوں کے درمیان سوتے تھے ۔ آب تیرہ پیتے تھے ۔ مناسب غذا تمہارے پاس نہیں تھی ۔ ایک دوسرے کا خون بہاتے تھے اپنوں سے قطع تعلق کرتے تھے اور ان سے جنگ کرتے تھے ۔ بت پرستی کرتے تھے تمہارے ہاتھ (پاؤں) اور دل گناہوں میں بندھے تھے (۱)

ہجرت رسول کے بعد مدینہ پہونچ کر تاریخ اسلام کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور تاریخ آئین محمد (ص) کے اندر ایک فصل جدید کا اضافہ ہوتا ہے اور

۱۔ نہج البلاغۃ فیض ص ۸۲

اس کے بعد تو نیروئے باطل پر پے در پے ایسی ضربیں لگائی ہیں کہ آخر کار باطل سرنگون ہوگیا۔

۵

رسول اکرم (ص) کا انقلاب مدینہ میں مضبوط ہونے لگا اور آپ کی دعوت گھر گھر عام ہونے لگی اور اس کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں اور ایک روشن معاشرہ کی بنیاد پڑنے لگی۔

رسول اکرم (ص) کی منطق اور افکار اس درجہ پر تھے کہ جنھوں نے سازمان فکری و اخلاقی و اجتماعی اور لوگوں کی زندگی پر چھائے ہوئے حکومت کے قوانین و سنن کو درہم و برہم کر دیا۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکا، ظلم و ستم کے تار و پود بکھیر دیے۔ طاقتوروں کو تخت کبریائی سے نیچے اتار دیا (اور یہی نہیں بلکہ) زندہ و جاوید شریعت کی حکومت نافذ کی۔ انصاف کا بول بالا ہوا، بہترین اخلاق کا لوگوں میں پرچار کیا۔ اور بہت تھوڑی مدت میں مدینہ کو ایک مذہبی، اجتماعی فوجی پائیگاہ بنا دیا۔

اور دوسری طرف مکہ کے تجربات، محاصرہ، شکنجوں، خودسازی کے پروگرام جیسی چیزوں نے مہاجرین کے تکامل کے اچھے خاصے مراحل طے کر دیے تھے اور جس طرح مدینہ عربستان کا معنوی و سیاسی قدرت کا مرکز بن گیا تھا اسی طرح سارے جہان میں اسلام کی تبلیغ و توسعہ کا پائیگاہ بھی ہو گیا تھا۔

اسی لئے رہبر اسلام نے اپنے آئین کو اس زمانہ کے تمام ملت و مذہب والوں پر پیش کیا اور تمام انسانوں کو پرچم توحید اور اپنی زندہ تعلیمات کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دی۔ اور نصف صدی سے کم مدت میں اس دور کے آباد و بڑے بڑے ملکوں میں آپ کے آئین نے سایہ کر لیا۔ اور آمادہ و مستعد قلوب

پر باران رحمت و برکت کی طرح برسنے لگا۔

جو لوگ واقعات و حادثات کی گہرائی کو درک نہیں کر پاتے وہ اسلام کی سرعت و ترقی کو ایک اتفاق کہتے ہیں۔ حالانکہ کائنات کے اندر ہونے والے واقعات کو اتفاقی ماننا قابل توجیہ نہیں ہے۔ کیا واقعی ایک اخلاقی، فلسفی، حقوقی نظام کی بنیاد کسی اتفاقی چیز پر ہو سکتی ہے؟ کیا یہ اتفاقی بات ہے کہ پوری تاریخ میں تمام عربستان کے اندر ایک مکمل نظام کی چنگاری بھڑکی اور ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی؟

اگر مختلف اجتماعی اسباب کی بنا پر اس قسم کی عظیم جنبش دنیا کے سامنے پیش کی گئی تو قوانینِ علمی و جامعہ شناسی کی بنیاد پر اس منطقہ میں اس قہرمانِ طبیعی کی دوبارہ تکرار کیوں نہیں ہوئی؟ اور یہ تاریخی حادثہ دوسرے تاریخی حوادث سے کیوں جدا ہوا؟ اور ایک وحدت مستقل کو تشکیل دے کر پھر ایک مدار بستہ میں ہمیشہ کے لئے موقوف ہو گیا؟

کوئی بھی انقلاب جو معاشرہ کے اندر تکامل پیدا کرتا ہے اگر وہ زائیدۂ شرائط ہے تو ناگہانی طور سے اور کسی سابق مقدمات کے بغیر اس کا تحقق ناممکن ہے۔ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ ایک لہر اور موج کی صورت میں ظاہر ہو اور پھر رفتہ رفتہ اس موج کا دامن وسیع ہوتا جائے اور تدریجی طور پر شرائط رہبری ایک شخص کے اندر مکمل ہو جائیں۔

لیکن رسولِ اسلام کے تاریخ رسالت میں حلقہ ہائے حرکت فکری کا کوئی سلسلہ پہلے سے نہیں ملتا اور جن مفاہیم و بلند افکار کو آپ نے پیش کیا اس کے لئے پہلے سے کوئی زمین نہیں ہموار فرمائی اور نہ پہلے سے اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

اسلام کی انقلابی موج صرف وجودِ پیغمبر کی رہینِ منّت ہے۔ پہلے سے

اس کے مقدمات نہیں فراہم کیے گئے تھے ۔ یہ انقلابیوں کی تحریک نہیں ہے جس میں رسالت نے رشد حاصل کیا ہو ۔ بلکہ آغازِ بعثت سے ہی اصحابِ رسولؐ کی انقلابی تحریک کا واحد مرکز وجودِ پیغمبرؐ تھا ۔ اس کو یوں سمجھئے کہ موج جدید انقلاب محمدؐ کی ایک جزئی ہے نہ کہ رسولِ اکرمؐ موجِ انقلاب کے جزئی ہیں اسی لئے پیغمبرؐ اسلام کی انقلابی جنبش میں اور دیگر تاریخی انقلابات میں بہت زیادہ فاصلہ ہے اور فرق ہے ۔

اسلام کا انقلاب ایک ایسی وسیع تحریک ہے جو زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے ۔ انسانی اقدار و مفاہیم کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔

اسلامی تعلیم کے نتیجہ میں قبیلوں کے اجتماع میں ایسی شکست و ریخت ہوئی کہ اب وہ ایک ایسے اجتماع کی تشکیل میں لگ گئے جہاں دنیا کے تمام لوگ مجتمع ہو جائیں اور تمام دنیا کے لوگ پرچمِ اسلام کے نیچے جمع ہو جائیں ۔

آیئے اس سلسلے کے حقائق کو دوسروں کی زبانی سنیں :

پنڈت جواہر لعل نہرو ـــــ جو ایشیا کے مشہور و عظیم سیاسی شخصیت کے مالک تھے ـــــ کہتے ہیں : کتنی حیرت کی بات ہے کہ عرب قوم جو زمانۂ دراز سے خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی تھی اور بظاہر اطراف و جوانب میں جو کچھ بھی ہوتا تھا اس سے الگ تھلگ اور بے خبر تھی لیکن ناگہانی طور پر جب یہ بیدار ہوئی تو عجیب و غریب طاقت کے ساتھ دنیا کو زیر و زبر کر دیا ۔ عربوں کی سرگذشت اور ایشیا ، یورپ ، افریقہ میں اتنی جلدی چھا جانا اور بلند و برتر تمدن اس طرح پیش کرنا یہ تاریخ بشر کا حیرت انگیز کارنامہ ہے ۔

جس طاقت و فکر نے عربوں کو بیدار کیا ۔ اور انکو اپنے نفس پر اعتماد و بھروسہ کرنا سکھایا اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کیا وہ " اسلام " تھا ۔

اور یہ مذہب ایک جدید رسولؐ ـــــ جس کا نام نامی محمدؐ تھا ـــــ کے ذریعہ شروع ہوا رسولؐ اسلام نے فتح مکہ سے پہلے اسی شہر مدینہ ـــــ جو اسلام کا دار السلطنت تھا ـــــ سے دنیا کے بادشاہوں اور حکمرانوں کو پیغام بھیجا اور ان کو خدائے یکتا اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دی ۔ ان پیغاموں کے بھیجنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسولؐ کو اپنے اوپر اور اپنی رسالت پر کس قدر بھروسہ تھا ؟ اور آپ چاہتے تھے کہ لوگوں میں بھی یہی اعتقاد و اطمینان پیدا ہو جائے اور آپ نے ان کو وہ طاقت بخشی جس کے سبب یہ صحرا نشین بغیر کسی دشواری کے اس زمانہ کے نصف عالم پر مسلط ہو گئے ۔

جو بھی شخص مسلمان ہوتا تھا اس کو سب سے پہلے برادری اور برابری کا پیام دیا جاتا تھا اور اس اسلامی برادری کی دعوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ـــــ یہ بات ملحوظ رہے کہ اس زمانے کی مسیحیت کی تعلیم نہایت فاسد تھی ایسے وقت میں جب اسلام نے برادری کا پیام دیا تو ـــــ نہ صرف بدو حضرات کے لئے بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جہاں مسلمان فاتح بن کر جاتے تھے یہ مرغوبیت بہت پرکشش ثابت ہوا ۔ (۱)

ایک ایسی شخصیت کے ذریعے جن کے پاس نہ مادی طاقتیں تھیں نہ امکانات تھے اور نہ ظاہران تک رسائی تھی ، جس نے (دنیا میں) نہ تو علمی و فنی تحصیلات و آموزش سے بہرہ برداری کی تھی اور نہ دوسروں کے سرچشمۂ معلومات سے ایک قطرہ حاصل کیا تھا ۔ تاریخ بشر کے اندر حیرت انگیز تحول و انقلاب کا لانا یہ نہ صرف یہ کہ امر عادی و فطری نہیں ہے بلکہ اس عظیم شخصیت کی

۱۔ تاریخ جہان پر ایک نظر ۔ تالیف پنڈت نہرو ج ۱ ص ۳۱۷ ـ ۳۲۲

مافوق العادت طاقت پر شاہد بین ہے۔

اگر داخلی دشمنوں نے حضور کو داخلی جنگوں میں مبتلا نہ کر دیا ہوتا تو آپ اس سے کہیں پہلے اور عظیم طاقت کے ساتھ دوسری ملتوں کو دعوت دیتے۔ لیکن دشمنوں کے گوناگوں حملے، جنگیں آپ کو مہلت نہیں دیتی تھیں۔ اس لئے آپ کے وقت کا بیشتر حصہ حوزۂ اسلام کے دفاع میں گذر گیا۔

آج چودہ سو سال سے زیادہ مدت گذر جانے کے بعد بھی کائنات پر آپ کی کامیابی نمایاں ہے۔ کتب خانے، کتابیں جو انسانی سعادت کی ذمہ داری ہوتی ہیں وہ سب صحائف آسمانی سے پُر ہیں۔ آج بھی کروڑوں انسانوں کی زبان پر بڑے عزت و احترام کے ساتھ آپ کا نام نامی و اسم گرامی جاری ہے۔ تمام دنیا میں میناروں سے آپ کا نام پکارا جاتا ہے۔ اور وعدۂ الٰہی کے مطابق ہمیشہ بام و شام سے یہ آوازیں آئیں گی اور دلوں کے گہرائی تک نفوذ کر جائیں گی۔ اور دلوں کو روشنی بخشیں گی۔ خداوند عالم نے قرآن میں اعلان کیا ہے؛ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۱) اور ہم نے تمہارا ذکر (بھی) بلند کر دیا۔

۱۔ سورہ انشراح آیت ۴

بہتر قرآن شناسی

رسولؐ اسلام کے رسالت کے اثبات کے وہی طریقے ہیں جو ہم پہلے بیان کرچکے اور تمام وہی شرائط و علامات جن کا ہر آسمانی رہبر کے اندر ہونا ضروری ہے ۔ رسولؐ اکرم کے اندر بھی ان کا پایا جانا ضروری ہے ۔

رسالت کے لئے ایسے معجزہ کا ہونا ضروری ہے جو اس بات کو ثابت کرے کہ اس کا تعلق ماورائے طبیعت سے ہے اور رسالت سے اس کی جدائی ناممکن ہے ۔ معجزہ وہ کھلا ہوا برہان ہے کہ جس کے اظہار کے بعد مخالفین کی تمام بے منطق دلیلیں ختم ہوجاتی ہیں اور وہ اس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ یہ شخص اپنے دعویٰ میں سچا ہے

یوں تو تمام انبیاء اپنی رسالتِ الٰہی کے انجام میں ایک ہی مقصد رکھتے تھے ۔ بلکہ ہر ایک کی خصوصیات سے قطع نظر کرتے ہوئے دیکھا جائے تو انکی نوعِ تعلیمات میں ہم شبیہ نہیں ۔ البتہ موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر خصوصیات زمانی کے لحاظ سے اپنے طریقۂ عمل کے مطابق ترقی و تکامل میں پیشرفت ہوئی تھی

مختلف انبیاء کے مختلف قسم کے معجزات دیے جانے کا فلسفہ جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ تھا کہ سابق انبیاء کے دورانِ رسالت لوگوں کی توجہ مشاہدات اور آنکھوں سے دیکھ لینے پر موقوف تھی ۔ اور اس زمانہ کے کاہن و ذہین لوگ عوام کے افکار پر جو قید و بند لگاتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عمومی افکار ایک محدود مرکز پر جمع رہتے تھے ۔ اور خدا سے دوری کا سب سے بڑا سبب

یہی تھا۔ اور فکرِ بشر کے انجماد کی علت بھی یہی تھی ۔

اسی لئے انبیائے الہٰی خدا کی طرف سے اسی بات پر مامور تھے کہ اس حساس ترین نقطۂ انحراف کو آماجگاہِ تبلیغ قرار دیں۔ اور اسی طرح کی چیزوں سے ـــــ یعنی جو عوام کی نظروں میں اسی طرح ہو مثلاً معجزات ـــــ ان لوگوں کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جائیں اور اپنی اعجازی طاقت سے مخلوق کی خدا سے جدائی والی علت اور افکار کے ایک جگہ محدود ہو جانے کے سبب ‹‹ یعنی اس زمانہ کے کاہنوں اور قہرمانوں کی نظر بندیوں و حیرت انگیزیوں کو جو انسانی روحوں کو اپنے جال میں پھانس لیتے تھے ›› کو باطل قرار دیں اور اپنے اعجاز کی نمائش اور دینِ الہٰی کے واقع بینانہ اصول کو پیش کر کے آدمیوں کے سامنے رشد و ہدایت و تکامل کے دروازے کھول دیں۔ اور انسانوں کی تمام ابعادِ زندگی اور ان کے حالات کو خدا سے جوڑ دیں ۔ معجزہ کی حقیقت کا یہ صرف ایک گوشہ ہے۔

حضور اکرم م بھی ایک ایسے معاشرہ میں آسمانی رسالت کے لئے منتخب کئے گئے جس میں عوامی افکار ! انشائے کلام بلیغ، پسندیدہ و شیریں اشعار پڑھنے اور ادبی ابتکار کے محور کے گرد گھومتے تھے ۔ اور ایسے ہی محور کے گرد گردشِ فکری کا ہونا جو نہ اصولی مسائل کا جزء تھا اور نہ انسانی زندگی کے حیات بخش اجزار میں تھا ۔ (اسی چیز) نے خدا سے لوگوں کو بے توجہ بنا دیا تھا ۔ اور افکار میں جمود و توقف کا سبب بن گیا تھا ۔

ان حالات میں پروردگارِ عالم نے اپنے رسول (ص) کو قرآن جیسے ہتھیار سے مسلح کر کے بھیجا، جو ادبائے عصر کے آثار سے مشابہ تھا ۔ البتہ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ منحصر بہ فرد تھا اور ایسا حیرت انگیز جو عہدۂ بشر سے خارج تھا ۔

آیاتِ الہٰی کی کشش و شیریں بیانی نے قومِ عرب کے دلوں کو احساس و ادراک

سے پُر کر دیا اور وہ لوگ اس امانتِ الٰہی کی طرف بہت گہرائی سے متوجہ ہو گئے۔ قومِ عرب جو فنِ بلاغت اور اس کے آثار و رموز سے مکمل طرح آگاہ تھی اس بات کو سمجھ گئی کہ قرآن کی بلاغت بشری طاقت سے باہر ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کو سن کر اور معانی کو سمجھ کر اسکی طاقت بلاغت سے متاثر نہ ہوجائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نزولِ وحی کے ساتھ ساتھ لوگوں کا تأثر بڑھتا گیا اور دینِ الٰہی کی طرف میلان کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔

رسول اکرم (ص) اگر قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ پیش کرتے تو عرب کی عام ذہنیت کی بنا پر وہ قابلِ توجہ نہ ہوتا اور اس میں شک و تردید کے راستے کھل جاتے لیکن چونکہ اس زمانہ کے عرب فنِ سخنوری سے بخوبی آگاہ تھے اور لغت و ادب کے اساتذہ اور قہرمانانِ بیان ان کے درمیان موجود تھے۔ اس لئے وہ قرآن کی بلاغت خارق العادہ کی تردید کر ہی نہیں سکتے تھے۔

دیگر انبیاء کے معجزات ان کے زمانہ تک محدود تھے یہ اس بات کی دلیل تھی کہ انکی شریعتیں ناپائدار اور وقتی تھیں۔ لیکن رسولِ اسلام (ص) کی نبوت تمام جہان کے لئے تھی اور آپ کی شریعت تمام شرائع میں مکمل ترین شریعت تھی اسلئے آپکو وقتی معجزہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ بلکہ جیسے آپ کا دین ابدی ہے اسی طرح آپ کا معجزہ بھی ابدی ہونا چاہیئے۔

دائمی رسالت کے لئے دائمی معجزہ ہونا چاہیئے جو ہر زمانہ میں کارآمد ہوتا کہ جس طرح گذرے ہوئے لوگوں پر حجت تمام کرتا ہے آئندہ لوگوں کے لئے بھی حجت تمام کرے۔ کیونکہ جس معجزہ کی عمر کوتاہ ہوگی اور بعد والی نسل کے لئے قابل رؤیت نہ ہوگا۔ اس سے مستقبل والوں کے لئے حجت نہیں پیش کیا جا سکتی اس لئے قرآن مجید کو بہ عنوان معجزۂ ابدی و پائدار اور خدا کا آخری کلام کے عنوان سے

پیش کیا گیا ۔

پیغمبر اسلام (ص) نے مقدماتی تدارکات کے بغیر جس دن سے اپنے آئین کو بصورت مکتب جہانی پیش فرمایا ہے کہ جس کے نفوذ کا منطقہ نسلی اور جغرافیائی سرحدوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا ۔ اسی دن سے اس جاودانی سند کو اس بات کے اثبات کے لئے بھی پیش کیا کہ میں پوری کائنات کے لئے نبی بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں ۔ تاکہ یہ زندہ دلیل ہو کہ آپ کی بعثت و جنبش انقلابی تاریخ بعثت اور انبیاء کے جنبشہائے انقلابی کی آخری فصل ہے ۔

اسی لئے بعثت رسول (ص) کا معجزہ خاتم بعثت کا معجزہ ہے ۔ اور قرآن نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں ہر جگہ بر نزول آیت کے تحت شرائط ۔ یا تاریخی واقعات بیان کرنے کے ضمن میں یا عصر رسول اسلام میں ہونے والے واقعات کی شرح میں ۔ یا زندگی کے گوناگوں مسائل کے بارے میں بصورت تمثیل زندگی کے بالاتر مراتب کیلئے ہدایت بشر کی خاطر اسطرح سے لازمی راہنمائی کر دی ہے کہ جس سے واقعات کی تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ اور ان جاری حوادث کے ذریعہ جس میں ان تحولات کے مورد پر قرآن کی قضاوت اور اس کا نقطۂ نظر حاوی ہے ان سے کلی اصول کا استنباط کیا جا سکتا ہے ۔

اسلام نے جو روحانی تحول اور تاریخی و اجتماعی انقلاب پیش کیا ہے وہ ایک ایسا راز ہے جس کو قرآن کے تدریجی فلسفہ کے علاوہ کہیں سے درک نہیں کیا جا سکتا اگرچہ سطحی و جاہل افراد کی نظر میں قرآن کا تھوڑا تھوڑا نازل ہونا باعث نقص سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن اگر تاریخی واقعات اور زمانہ کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پیغمبر ؐ کی دعوت کی کامیابی میں بنیادی طور سے اس کا دخل ہے

۵

جسطرح طویل بیماری طویل علاج چاہتی ہے ۔ اسی طرح جو عوامل مستمر طریقہ

سے انسان کو حقائق ہستی تک پہونچنے سے روکتے ہیں اور اس کی رشد و بلندگی سے مانع ہوتے ہیں وہ بھی ایک ایسے فکری نظام اور ہمہ جانبہ اجتماعی اصول کے محتاج ہوتے ہیں جو اپنے فکری خطوط کو ترقی دے سکیں اور انسان کو ایک معین مقصد ــــ یعنی انسان کو خود اپنے سے بیگانگی کی قید و بند سے آزاد کرا سکے اور ایک مقصد ــــ کی طرف رہبری کر سکیں۔

اور اس صورت کے علاوہ مسئلہ کا حل ناممکن ہے اور صرف اسلام ہی ایک ایسا مکمل نظام ہے جو ان تمام خصوصیات کا حامل ہے اور تمام ضرورتوں کا جواب دے سکنے والا ہے۔

مسلمان تو قرآن کے اعجاز پر صرف دینی عقیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن اہل نظر و اہل تحقیق علمی عقیدہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ جہاں بینی اور محتوای علمی و تربیتی اور فرد و اجتماع پر قدرت رہبری کے لحاظ سے قرآن حیرت انگیز حد تک جامعیت رکھتا ہے اور اس میں ابھی بہت زیادہ تحقیق کی جا سکتی ہے اور علمی تحقیق کی تو اس میں ضرورت سے زیادہ ضرورت ہے۔

۞

قرآن مکتب اسلام کی تحقیق و کند و کاوش کا اصلی منبع ہے۔ اور ہر زمانے اور ہر دور اور دنیا کے ہر گوشہ میں ایک ایسا کامل و آزاد معاشرہ وجود میں لا سکتا ہے جس کے زیر سایہ انسان کی تمام چھپی ہوئی طاقتیں اور تمام استعدادیں اجاگر ہو سکتی ہیں اور ان بستہ راہوں کو کھول سکتا ہے جو ایک آئیڈیل معاشرہ اور حکومت الٰہی والے معاشرہ تک پہونچاتی ہیں۔

قرآن کو نازل ہوئے چودہ سو سال سے زیادہ مدت گزر گئی اور اس مدت میں انسان نے بہت سے تغیرات کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اور رشد و تکامل

کے مراحل طے کر کے آفرینش کے اسرار و رموز کو وسیع پیمانہ پر حل کر چکا ہے۔ اس کے باوجود سلسلۂ تاریخ میں ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اس کی احتیاج رہی ہے، اور وہ اپنا معرف رہا ہے۔

اس معجزہ (قرآن) نے اسی وقت سے جب کہ لوگوں کے اندیشہ و فکر کو کمال نہیں حاصل ہوا تھا۔ یقینی طور سے پیغمبر اسلام کی رسالت کو ثابت کر دیا تھا اور آج بھی جب کہ نسلِ بشر اپنے کو ادراک و علم و مدنیت کے درجۂ کمال پر فائز سمجھتی ہے۔ اسی طرح بہ عنوانِ معجزۂ مستمرِ تاریخی اور بصورت زندہ دلیل کے خاتم الرسل (ص) کی حقانیت کو ثابت کر سکتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ انسانی معلومات کے حدِ کمال پر پہونچنے اور فکر کے تازہ افق کی وسعت نے ہمارے لئے یہ بات ممکن بنادی ہے کہ گذشتہ لوگوں کے بارے میں مزید استفادہ کر سکیں۔

اگر قرآن فقط کسی ایک معین حصۂ زمان یا محدود مکان کے بارے میں اپنی توجہ مرکوز رکھتا تو اپنی اعجازی خصوصیت کے باوجود زمانۂ مستقبل کے بارے میں پیشروی نہیں کر سکتا تھا۔ قرآن کے جاودانی ہونے کا راز ہی یہ ہے کہ زمانہ کے روز افزوں ترقی یافتہ حوادث کے بارے میں معنوی ہدایت بخش فرامین صادر کئے ہیں اور تمام حوادث کا اصلی منبع یہی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات کا ظہور اور آپ کا عمل معاشرہ کے درمیان مرحلۂ تفکر و تعقل تک پہونچ جانے کا بشارت دہندہ اور انسان کے ارادہ کو بسط و استقلال و توسعہ دینے والا تھا۔ باین معنی کہ انسان رشد اندیشہ کے مرحلہ میں تحقیق کے سلسلہ میں دیکھنے کے بجائے غور کرنے کی منزل میں گامزن ہوتا ہے اور فطری حوادث میں دقتِ نظر اور گہرائی فکر کے بجائے سادہ اندیشی کو اختیار کرتا

ہے تاکہ غیر طبیعی حوادث اور خارقِ عادت اشیاء میں انبیائے سابقین کے رسالت کی طرح معجزہ کے سامنے سرنگوں ہو کر واقعی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو ۔

بلکہ دانش و تفکر "جس کی طرف قرآن بشر کو مسلسل دعوت دے رہا ہے" خود اسلام کے رسالتِ آسمانی کا اعجاز ہے ۔ کیونکہ صرف حسی معجزہ پر ہی دار و مدار آخری رسالت کے مزاج کے منافی ہے اور ہدفِ آزادی بخش و رشدِ خرد سے میل نہیں کھاتا ۔ اسی لئے پروردگار عالم نے ہزاروں سال پہلے سے تدریجی طور پہ بشریت کو اس آخری ہدایت کے لئے آمادہ کرنا شروع کر دیا تھا ۔

قرآنی تحقیق و جستجو کا ثمرہ اسی وقت مل سکتا ہے جب محقق کا ذہن پہلے کی تصویر اور پیشگی عقیدہ سے خالی ہو ۔ کیونکہ پہلے ہی سے قرآن کریم سے عصبیت رکھنا اور اپنا فیصلہ پہلے ہی سے رکھنا صرف جمود و تحجر کا سبب ہوتا ہے اور یہ بات ایسی ہے کہ ہر منصف مزاج محقق کو اس سے بچنا چاہیئے ۔

۵

یہ بات مسلّمات سے ہے کہ قرآن عقلمندوں کی کسی کمیٹی کے افکار کا نتیجہ نہیں ہے ۔ اور یہ ناممکن ہے کہ جب عقلائے دہر کا مجموعہ ایسی چیز نہیں پیش کر سکتا تو صرف ایک آدمی "جس نے دنیا میں کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہ کیا" تن تنہا جو جزیرۃ العرب جیسے پست ترین معاشرہ میں پیدا ہوا ہو اور ایسے زمانہ میں کہ جب عربوں کو علم و فلسفہ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا ۔ نہ اسکو پیش کر سکتا ہے اور نہ کہیں سے اقتباس کر سکتا ہے ۔

قرآن نے بشر کی بلندی کے لئے جو نظام پیش کیا ہے ۔ اگر اس میں غور کیا جائے اور سابق نظاموں و قوانین سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو روز روشن کیطرح یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ قرآن نہ تو ان سابق نظاموں سے اقتباس شدہ

شدہ ہے اور نہ ان سے مشابہ ہے بلکہ یہ بالکل نیا نظام ہے اور یہ انسانی معاشرہ میں انقلاب لانے والا اور معاشرہ کو عدل و انصاف کے پایوں پر قائم کرنے والا اور محروم و ستمزدہ لوگوں کو مساوات و آزادی دلانے والا ہے ۔

قرآن نے سابق امتوں اور پہلے کے انبیاء کے حالات اور ان کی زندگی کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے ۔

قرآن نے جو قصے بیان کئے ہیں اور جن حوادث کا ذکر کیا ہے وہ بیمثال واقعیت کے حامل ہیں ۔ ہر نظر میں دور و نزدیک اشارہ کے ساتھ حقیقت کے تار و پود کو ہم دیکھتے ہیں ۔

قرآنی حکایات کا توریت و انجیل سے نسخہ برداری کا امکان مکمل طرح سے منتفی ہے ، کیونکہ سرگذشت انبیاء کے بیان میں نقش قرآن مثبت قالب میں ہے ۔ قرآن خود اصلاح تغییر دیدیتا ہے ۔ پیغمبروں کے قصوں میں جو باتیں نامناسب ہیں یا فطرت توحید و عقل کے خلاف ہیں یا اصلی مذہبی بینش کے متضاد ہیں انکو حذف کردیتا ہے ۔ حالانکہ اگر نسخہ برداری ہوتی تو یہ بات ممکن نہیں تھی ۔ کیونکہ نسخہ برداری تقلید و اقتباس کا نام ہے جو منفی جنبہ رکھتا ہے

اس سلسلہ میں ڈاکٹر موریس بوکائے اسطرح اظہار نظر کرتے ہیں : مغربی ممالک میں یہودی ، عیسائی ، لامذہب بغیر کسی دلیل کے سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ محمد (ص) نے قرآن کو کتاب مقدس کی تقلید کرکے لکھا یا لکھوایا ہے ۔ اور یہی لوگ کہتے ہیں : قرآنی قصص ، دینی تاریخ نے عہدین کے قصص کو ابتدا سے لکھا ہے ———— یہ اعتراض ایسا ہی ہے کہ کوئی کہدے جناب عیسیٰ (ع) اپنے معاصرین کو عہد قدیم سے واقعات لے کر موعظہ فرماتے تھے اور اس سے لوگوں کو اپنا فریفتہ بنا لیا تھا ۔

پس جناب عیسیٰ (ع) پر جس طرح اعتراض غلط ہے اسی طرح محمد (ص) پر بھی غلط ہے۔

انجیل متی پوری کی پوری عہدِ قدیم سے ماخوذ ہے اسکے باوجود کون مفسر یہ سوچ سکتا ہے کہ اس بنا پر خدا کا رسول ہونے کی صفت حضرت عیسیٰ سے سلب ہوگئی؟

اسی طرح عہدینی قصص و قرآنی قصص میں دیگر موضوعات میں مشابہت خصوصاً جو چیزیں دینی تاریخ سے مربوط ہیں جائے انکار نہیں ہے (مگر اس سے رسول اکرمؐ کی رسالت سلب نہیں ہو جاتی)۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ مغربی ممالک والے حضرت عیسیٰ پر اعتراض نہیں کرتے کہ اس قسم کے اعمال اور عہدینی تعلیمات کا ذکر انجیل میں شروع سے کیوں کرتے ہیں؟ لیکن یہی لوگ بغیر کسی احساس کے محمد (ص) پر یہی اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ، چونکہ ان چیزوں کو محمد (ص) بعنوان وحی متعارف کراتے ہیں لہذا جھوٹے ہیں!

لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ ربّانیوں نے محمدؐ کو جو چیزیں یاد کرائی تھیں یا لکھوائی تھیں اور محمدؐ نے ان کو اپنے قرآن میں ذکر کیا ہے تو آخر وہ کیا ہیں؟ اور کہاں ہیں؟ یہ بالکل ہی بے بنیاد باتیں ہیں۔

بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ چودہ سو سال پہلے جو واقعات شائع تھے اور علمی نقطۂ نظر سے ان میں جو اشتباہات تھے ان اشتباہات کو دور کرکے اور ان صحیح واقعات کو جنکی درستگی کو ہمارا آج کا ترقی یافتہ علم ثابت کر چکا ہے ایک شخص (امّی) بیان کرے اور انکی نشاندہی کرے؟ قرآن مجید نے داستانِ خلقت کو کتاب مقدس کے قصے سے بالکل ہی الگ بیان کیا ہے[1]

کہنا پڑتا ہے کہ حقیقت کا متلاشی انسان قرآن کیلئے جو ایک کتاب بھی ہے برہانِ رسالت بھی ہے اعجازِ پیغمبرؐ کا مظہر بھی ہے وحی الہٰی کے منبع کے علاوہ کسی اور چیز کا قائل نہیں ہو سکتا۔

۱۔ توریت انجیل، قرآن ص ۱۷۸، ۲۰۷

اسی وجہ سے قرآن ایک ابدی، روشن اور گہرا معجزہ بن کر خدا کی طرف سے آیا۔ تاکہ اسلامی تعلیمات وقوانین زمانہ کی رفتارِ ترقی کا ساتھ دے سکیں۔ اسی لئے ان دستورات اور قوانین کو الفاظ وجملات کے اعجازی قالب میں ڈھال کر ظاہر کیا۔ اور اسطرح کینہ توز دشمنوں اور انکی مکاریوں کا جواب دینے اور نظامِ دین کی حفاظت سے ارادۂ الٰہی متعلق ہوا۔ احکامِ الٰہی کے قالبوں کو پائیداری وثبات بخش کر دشمنوں کے ہاتھوں کو اس میں تغییر وتبدیل وتحریف سے ہمیشہ کے لئے قطع کر دیا اور تعلیماتِ الٰہی وقوانینِ خدا زمانہ کے ساتھ ساتھ مستقر کر دیا۔

قرآن کا ایک اعجاز اس پہلو سے بھی ہے کہ اس نے انسان زندگی میں ایک جہانی انقلاب اور عظیم تمدن پیدا کر دیا۔

اسلام کی شناخت میں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اس نے ایک جنگجو، پراگندہ، علم سے محروم ملت کو جو اپنے قبیلوں کے اتحاد سے بھی بے خبر تھی اسکو ایک جہانی ملت بنا دیا۔ اسی طرح وسیع ومعنوی ابعاد کے ساتھ ایک ایسے تمدن کی بنیاد رکھی جس میں اپنی ذات کے علاوہ کسی سے مدد نہیں چاہی۔ بلکہ اس کے برخلاف دنیا کے انقلابات اور نسل وقوم وطبقاتِ اجتماعی کی بنیاد پر بین الملی قانون سازی، آزادیٔ فکر ودانش، تکریمِ علم یہ ساری چیزیں قرآن واسلامی نظام کی مرہونِ منت ہیں۔ ان تمام چیزوں نے قرآن سے استفادہ کیا ہے قرآن نے ان سے استفادہ نہیں کیا۔

بلکہ حملہ آوروں نے جب اسلامی سرزمینوں پر حملے کئے اور اپنی قومی برتری کی بنیاد پر مسلمانوں پر غالب آگئے۔ تو بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کو اپنا ہم مذہب بناتے اسلام کی معنوی قوت سے متأثر ہو کر مغلوب ملت کا مذہب قبول کر لیا یعنی مسلمان ہو گئے ______ اور ملتوں کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتا کہ غالب

قوم نے مغلوب قوم کے مذہب کو قبول کرلیا ہو یہ صرف اسلام کی ہی خصوصیت ہے۔

قرآنی چیلنج

قرآن مجید عربی زبان میں ــــ جو دنیا کی مالدار ترین زبان ہے اور استحکام ترکیب اور لغوی وسعتِ دامانی کے لحاظ سے مکمل پرمایہ ہے ــــ جاہلیت کے تاریک ترین دور میں برق جہندہ بن کر نازل ہوا ۔ لیکن اپنی خصوصیت اور مختصر جملہ میں بڑے بڑے عظیم مطالب بیان کردینے کی صلاحیت کے اعتبار سے بولی جانے والی عربی زبان سے دور کی بھی مشابہت نہیں رکھتا۔

نزولِ قرآن کے وقت عرب کا شعری و نثری سرمایہ اور انکی فطرت وطبیعت اوج کمال پر تھی، شعراء و خطباء کے تخلیقات حیرت انگیز جذابیت کے ساتھ لوگوں کو متوجہ کرلیتے تھے اور ممتاز ترین اجتماعات میں صرف ادبیات ہی کو ممتاز طبقوں میں وجہِ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

ان حالات میں سند پیغمبرِ اسلام (ص) (قرآن) انہیں حروف و کلمات سے مرکب تھی جو پہلے ہی سے لوگوں کے دسترس میں تھے ۔ یہ قرآن ۲۳ سال کی مدت میں حسبِ ضرورت ہائے خاص نازل ہوتا رہا اور قدم بہ قدم رسول اکرم (ص) اور اصحابِ کرام کو بلند مقاصد کی طرف متوجہ کرتا رہا۔

قرآن کے الفاظ و عبارات نہایت موزوں ، کلمات کی ترکیب بہت ہی دل انگیز اور اسی کے ساتھ اپنے دامن میں دقیق معانی کا سمندر لئے ہوئے ہے ان الفاظ کو ان معانی کے ساتھ جمع کردینا بھی ایک وجہ امتیاز ہے اور اعجازِ قرآن کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔

نزولِ قرآن کے بعد عرب ایک ایسے نئے و تازہ کلام سے آشنا ہوئے جو نہ شعر تھا نہ نثر لیکن اسکی جذابیت و ہم آہنگی شعر سے زیادہ تھی اور اس کا بیان نثر سے زیادہ دلنشین تھا۔ اس کا عالم یہ تھا کہ سننے والا مجذوب و منقلب ہو جاتا تھا اور مفاہیم کی برتری، شیوائی اسلوب، بیانئے ظاہری اور مختصر لفظوں میں عالی مفہوم یہ ایسی باتیں ہیں جو قرآن کو دوسرے لوگوں کے کلام سے بنیادی طور سے الگ کر دیتی ہیں۔

۵

قرآن نے لوگوں کو محکم و مضبوط قوانین، روشن منطق، دین کا راستہ، اچھی زندگی بسر کرنے کا راستہ دکھایا اور تاریخ کے بے نظیر شجاعت کی طرف ان کے ارادوں کو آگے بڑھایا اور ظالموں و ستمگروں نے جو خرافات کا خرمن اکٹھا کر لیا تھا اس کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

قرآن نے فکر کا وہ راستہ کھولا جو حقیقت تک منتہی ہوتا ہے اور اس نے کہا وہ راستہ یہ ہے کہ خواہشات، تعصب، جنگجویانہ طریقہ سے الگ ہو کر سوچا جائے۔ اور جس دن سے رسولِ اسلام (ص) نے یکتا پرستی کی تبلیغ شروع کی۔ اسی دن سے لوگوں کو واقع بینی کی طرف دعوت دی۔ عبرت بین آنکھوں، شنوا کانوں، اندیشمند و راستہ جو عقل کو ایمان لانے کیلئے مخاطب کیا، عرف و عادت کی زنجیروں کو توڑ دیا، دیرینہ میراث یعنی جنگجو طبیعت کو مائل بہ صلح کیا، اور اس بات کی کوشش کی کہ شرک آلود عقائد اور لجاجت آمیز تعصب پر زیادہ اصرار نہ کریں۔ اور اس سلسلہ میں ہر تلخی کو برداشت کیا ہر تکلیف کو گوارہ کیا اور پروردگار نے انسانوں کی کامیابی کے لئے جس پروگرام کا وعدہ کیا تھا جب تک اسکو وفا نہیں کر دیا۔ سکون و چین سے نہیں بیٹھے۔

قرآن کی جاذبیت کا عالم یہ تھا کہ بہت سے مشرکین کسی بھی طرح قرآن کو محض اس خوف سے نہیں سنتے تھے کہ مبادا اس کا نفوذ عمیق وحیرت انگیز کشش دلوں کو مسخر نہ کرلے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف کھینچ جائیں ۔ کیونکہ قرآن کی تاثیر سے وہ لوگ بخوبی آگاہ تھے ۔

مورخین تحریر کرتے ہیں : شدت علاقہ وکشش اور لوگوں کے اندرونی خواہش قرآن سننے کیلئے اس درجہ تھی کہ کفار قریش کے کچھ لوگ راتوں کو پوشیدہ ہو کر رسول (ص) کے گھر چھپ جایا کرتے تھے اور سفیدۂ سحری کے نمودار ہوتے ہی وہاں سے نکل جاتے تھے اور اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ رسول خدا کی زبان پر جاری ہونے والی آیات کو سنیں اور یہ صورت متعدد مرتبہ واقع ہوئی ۔ (۱)

پیغمبر اسلام نے ابتدائے نزول قرآن ہی کے وقت رسمی طور پر یہ دعویٰ کیا تھا کہ قرآن خدا کا کلام ہے ۔ کوئی بشر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ اور اگر یقین نہ ہو تو امتحان کرلو ۔ اور اس سلسلہ میں جس سے بھی چاہو مدد حاصل کرسکتے ہو ــــــ لیکن عملی طور پر کسی نے بھی مثبت جواب نہیں دیا اور قرآن کے کسی چھوٹے سے سورہ کا بھی جواب اس وقت لوگ نہیں دے پائے ۔

سب سے زیادہ تعجب والی بات یہ ہے کہ خود پیغمبر اسلام کا کلام قرآن سے کسی طرح بھی شباہت نہیں رکھتا تھا ۔ اور یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ قرآن کا منبع افکار پیغمبرؐ کے علاوہ ہے ۔

قرآن نے نہ صرف عصر رسالت کے لوگوں کو ہی چیلنج نہیں کیا تھا بلکہ پوری

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۸۶

دنیا کو اور ہر زمانہ کے ہر شخص کو چیلنج کیا تھا کہ میرا جواب ممکن ہو تو لاؤ! اور پھر ایک عام اعلان پوری کائنات کے لئے (قیامت تک کے لئے) کیا: اگر تمام جن وانس مجتمع ہو کر اس قرآن کا جواب لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے چاہے وہ سب ایکدوسرے کے مددگار بن جائیں۔ (۱)

اس کے بعد چیلنج کی زبان کو بدل کر دوسری طرح اعلان کیا: کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ قرآن ہماری طرف سے نہیں ہے بلکہ اے رسولؐ تم نے میری طرف جھوٹی نسبت دی ہے؟ تو ان سے کہدیجئے کہ تم لوگ صرف دس سوروں کا جواب لے آؤ اور خدا کے علاوہ جس سے بھی چاہو اس سلسلے میں مدد بھی لے سکتے ہو (۲)

اس کے بعد تیسرے مرتبہ مزید اعلان کیا: اے لوگو ہم نے اپنے بندے پر جو کتاب نازل کی ہے اگر اس کے آسمانی ہونے میں تم کو شک ہے تو (صرف) ایک (ہی) سورہ کا جواب لاؤ۔ (۳)

حالانکہ لوگ جانتے ہیں بعض چھوٹے سورے تو چند مختصر جملوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ اور قرآن نے ان کو ہوشیار کر کے یہ بتادیا کہ یہ لوگ ایک چھوٹے سے سورہ کا جواب نہیں لا سکتے تو پورے قرآن کا کیا لائیں گے؟ اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) نے لوگوں کے درمیان چالیس سال زندگی بسر کی لیکن نہ تو کسی ادبی مقابلہ میں شرکت فرمائی اور نہ فنون سخنوری کے لحاظ سے اپنی قوم پر کوئی امتیاز حیثیت پیدا کی اس کے باوجود ایک ادبی سرمایہ کے ذریعہ ان لوگوں کو چیلنج کیا اور ایک بار نہیں بلکہ کئی بار۔ لیکن یہ لوگ جواب نہ لا سکے۔

۱۔ سورہ اسراء آیت ۹۰ ۲۔ سورۂ ہود آیت ۱۵ ۳۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۳

یہ پس منظر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ قرآن نے یہ چیلنج اس قوم کو کیا کہ جس قوم کے سربراہوں، اس کی جان و مال، آئین کہن، آباء و اجداد کے مذہب پر قرآن نے اتنا زبردست حملہ کیا تھا کہ اس قوم کی اجتماعی حیثیت خطرے میں پڑ گئی تھی ایسی صورت میں اگر قرآن کا جواب عربوں سے ممکن ہوتا تو وہ لوگ فن فصاحت کے اساتذہ سے مدد لے کر ـــــ جن کی تعداد اس زمانہ میں کم نہیں تھی ـــــ قرآن کا جواب لاتے۔ اس کے دلائل کو رد کرتے۔ اس کے براہین کو توڑ دیتے اور تاریخ کے صفحات میں زندۂ جاوید بن جاتے۔ لیکن ایسا نہ کرنا یہ دلیل ہے کہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے۔

ایک بات اور بھی ہے کسی اسلوب و طریقہ کی پابندی و مداومت ـــــ خواہ وہ کوئی بھی زبان ہو ـــــ انسان کو اسی طرح کی تقریر و تحریر کے نمونہ پر قادر بنا دیتی ہے ـــــ مگر قرآن میں یہ دستور بھی دم توڑ دیتا ہے آپ چاہے جتنی تمرین و مداومت کریں قرآنی آیتوں کا نمونہ نہیں پیش کر سکتے۔ اور یہ بات خود اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ قرآن کی تقلید و نمونہ سازی تعلیم و تمرین سے باہر کی چیز ہے۔ اور تاریخ نے بھی یہ نہیں بتایا کہ قرآن کے اس چیلنج کو کسی نے توڑا ہے اور نہ ہی تاریخ قرآن جیسی کوئی آسمانی کتاب پیش کر سکی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ پیغمبر اسلام (ص) کے خطبوں میں بھی اسلوب و بلاغت کے اعتبار سے قرآن سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔

اور یہ فطری بات ہے کہ دشمن طاقتیں، مخالف فصحاء و بلغاء اگر قرآن کا جواب لا سکتے تو اتنی جنگیں، نقصانات (جانی و مالی دونوں) سختیاں، ترک وطن کی صعوبتیں کبھی برداشت نہ کرتے بلکہ اس طرح سے کامیابی حاصل کر لینا بہت ہی آسان بات تھی۔ اور ان تمام مصائب سے بچ جاتے۔

لیکن جواب نہ لاکر اپنی تمام طاقتوں کو مقابلہ میں پیش کر دیا مگر نتیجہ کیا ہوا کوششیں رائیگاں ہو گئیں، توانائیاں افزائیوں سے بدل گئیں اور سب کچھ کر لینے کے بعد نہ تو قرآن میں ایک غلطی نکال سکے اور نہ بیانِ قرآن میں کوئی کوتاہی ثابت کر پائے اور تھک ہار کر اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ یہ کلام انسانی اندیشہ وبیان سے بالاتر ہے۔

قرآنی آیتیں آزاد فکر، شجاع لوگوں کے دلوں میں اتنی جلد اثر پیدا کرتی تھیں کہ جس کی مثال نہیں ہے۔ لیکن جاہل اور جمودِ فکر کے حامل افراد جن کی زندگی گنداب نادانی میں بسر ہوتی تھی وہی لوگ شدید مخالف تھے اور حقیقتِ اعجاز کے چہرہ پر پردہ ڈالنے کے لیئے قرآن کی طرف جادو و سحر کی نسبت دیتے تھے اور سحر سے مقصود سوائے آیاتِ الٰہی کے بے مانند اثر و نفوذ اور ما فوق العادت جذب و کشش کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے تھے ان کو آزار پہنچانا، ان کی تحقیر کرنا، ان کا مذاق اُڑانا ایک قسم کی بالغ نظری کی بات سمجھی جاتی تھی لوگوں کی فکر پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ اور بچکانہ باتوں سے مقابلہ کرنے پر تیار کر دیے گئے تھے، مثلاً کچھ لوگوں کی ڈیوٹی یہ تھی کہ جب تک رسولِ خدا (ص) آیاتِ الٰہی کی تلاوت کریں اس وقت تک وہ لوگ تالی بجاتے رہیں۔ سیٹی بجاتے رہیں شور و غل کرتے رہیں، تاکہ لوگ آیاتِ الٰہی کو سن کر اس کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

سردارانِ قریش کا طریقہ اور اس طریقہ پر اصرار یہ بتاتا ہے کہ حق و باطل کے درمیان مبارزہ کس منزل تک پہنچا ہوا تھا۔

قرآن نے بھی اس کی تصدیق کی ہے چنانچہ ارشاد ہے:
مشرک کہتے ہیں آیاتِ قرآن کو نہ سنو (بلکہ) اس کے درمیان شور

دعمل کیا کرو شاید اس طرح تم لوگ کامیاب ہو جاؤ۔ (سورۂ فصلت آیت ۲)
لیکن جبراً و قہراً لوگوں سے کے رابطۂ فکری کے قطع کر دینے میں یہ طریقہ زیادہ دیرپا نہیں ثابت ہوا۔ اسی لئے جب جبر و اکراہ کی بیڑیاں ٹوٹیں تو لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ بلکہ کچھ سرداران قریش ____ جو آئین جاہلیت سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے ____ کعبہ کے پردہ میں چھپ کر ایسی جگہ بیٹھ جایا کرتے تھے جو رسول خدا سے زیادہ دور نہ ہوتی تھی اور رسول اکرم (ص) نماز میں جب آیتوں کی تلاوت کرتے تھے تو یہ لوگ بگوش ہوش سنا کرتے تھے۔ یہ بات خود اس چیز کی دلیل ہے کہ قرآن نے لوگوں کے سامنے اپنا جو چہرہ پیش کیا تھا وہ کس حد تک لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھا۔
مختصر یہ کہ مشرکین عملی طور سے قرآن کے اس چیلنج کا جواب نہیں پیش کر سکے۔

عربوں کی یہ عاجزی تو طلوع اسلام کے وقت کی ہے کہ جب بڑے بڑے فصیح و بلیغ اس کی تقلید کرنے سے عاجز رہ گئے تھے۔
اور آج جبکہ پندرھویں صدی کا آغاز ہو چکا ہے اور قرآن کا چیلنج اب بھی ہے لیکن کوئی جواب نہیں ہے۔ روز افزوں علمی ترقی نے ہمارے سامنے تازہ افق ہائے فکر کھول دیئے ہیں۔ اس لئے اسکے سہارے ہم اور اک بلاغت قرآن و ناقابل تقلید و شناخت ترکیب انحصاری کے علاوہ دیگر مختلف زمینوں میں بھی منشأ الٰہی اور غیر متناہی ارزشوں کو دریافت کر سکتے ہیں اور باقاعدہ محسوس کر سکتے ہیں کہ قرآن ایک کھلا ہوا جاودانی معجزہ ہے۔ کیونکہ منکرین کے مقابلہ کی وجہ اسی طرح ثابت و برقرار ہے اور قرآنی چیلنج فضا میں آج بھی ساری دنیا سے چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے:
اگر قرآن کے آسمانی ہونے میں تم کو شک ہے تو ایک (ہی) سورہ کے مانند اس کا جواب لاؤ۔ (سورۂ بقرہ آیت ۲۳)

کیا انسان میں یہ طاقت ہے کہ قرآن کے ایک ہی سورہ کے مانند جواب دے کر سنگرِ اسلام کو فتح کرلے اور نبوت پیغمبر (ص) کو باطل قرار دیدے ؟

زمانۂ گذشتہ میں بھی اور موجودہ دور میں بھی ماہرین زبان و ادبیات عرب کے درمیان شدید دشمنِ اسلام موجود تھے اور ہیں اگر ان لوگوں کے لئے ممکن ہوتا کہ قرآن کا مثل لاسکتے ہوتے تو بلا کسی تأمل کے یہ ایسا اقدام کرڈالتے ۔

اسلام نے اپنے مقابلہ کے لئے خود ہی ایک سادہ سا راستہ پیش کردیا ہے تو پھر منکرین نبوت دور کا راستہ کیوں اختیار کرتے ہیں ؟ اور یہ آسان ترین راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے ؟ ظاہر ہے اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ قرآن تو درکنار اس کے ایک چھوٹے سے سورہ کا بھی جواب لانے پر قادر نہیں ہیں ۔

کیپ انگریزی دانشمند کہتا ہے :

حد یہ ہے کہ اگر خود قرآن کے حروف کو آپس میں ملا بھی دیں تو اس سے بہتر ترتیب ممکن نہیں ہے ۔ بس صرف سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ان حروف کو پھر انہیں کی جگہ پر رکھا جائے ۔

تاریخ کی روشنی میں ــــ اگرچہ اسکو زمانہ گزر چکا ہے ــــ پیغمبر اسلام (ص) کی جو خصوصیات پیش کی گئی ہیں اور تمام مورخین کا جس پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک ایسی قوم کے درمیان سے مبعوث ہوئے ہیں جس نے نہ درس پڑھا تھا اور نہ کتاب و استاد سے کوئی آشنائی رکھتی تھی اور نہ لکھنا جانتی تھی اور خود قرآن نے اس موضوع کو اس معاشرہ کے درمیان بطور صراحت بھی اعلان کیا جو تمام مراحل زندگی میں آپ کے ساتھ رہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

تم اس سے پہلے نہ کتاب پڑھتے تھے اور نہ تمہارے ہاتھ کچھ لکھا کرتے تھے (سورہ عنکبوت : آیت ۴۸) اور اس راستہ سے آپکی رسالت کا خدا کی طرف سے ہونا ثابت

کیا گیا ہے۔

اور یہ ناممکن سی بات ہے کہ کوئی شخص اپنے دشمنوں کے درمیان حقیقت کے خلاف بیان دے اور کہے کہ میں اُمّی ہوں میں نے درس نہیں پڑھا ہے اور کوئی شخص اعتراض نہ کرے۔

ویسے عمومی طور سے وہ زمانہ تعلیم و تعلم سے دور و بیگانہ تھا اس زمانہ میں درس کا وجود ہی نہیں تھا کہ کوئی حاصل کرتا۔ اور اگرچند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے تو ان کو انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا تھا۔ مورخین میں سے کسی نے بھی ایک ایسی جگہ کی نشاندہی نہیں کی کہ جہاں پر آپ نے رسالت سے پہلے ایک سطر پڑھا ہو یا لکھا ہو۔

یہی بات تعجب خیز ہے کہ ایک ایسا انسان جس نے کسی سے درس نہ پڑھا ہو وہ جنبش علم اور آزادیٔ فکر کا اتنا بڑا علمبردار ہو!

آپ کی ابتدائے پیغمبری اور میدانِ تاریخ میں قدم رکھنے سے بشریت نے ترقی کے ایک تازہ مرحلہ میں قدم رکھا اور آپ نے برق رفتاری کے ساتھ اپنی قوم کو دنیائے دانش و کتابت میں داخل کر دیا۔ اور ترقی کی وہ بنیاد رکھی جس سے عرب کا پسماندہ معاشرہ ایک بزرگ تمدن کے لئے آمادہ ہوگیا۔ اور صرف چند قرنوں کے بعد ہی عظیم ترین مجامع علمی، اور بزرگ ترین دانشمندان جستجو کنندہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

۵

دنیا کے غیر مسلم علماء و دانشمند حضرات نے اسلام کے سلسلہ میں جو نظریات اور اپنے فیصلے دیئے ہیں ان سے قرآن کی گہرائی اور اعجاز سے ہم اور زیادہ آشنا ہوتے ہیں، چنانچہ کونستان ورژیل گیورگیو تحریر کرتا ہے:

حالانکہ وہ شخص امی تھا لیکن قرآن کی پہلی آیات جو اس پر نازل ہوئیں اس

میں علم و قلم، تعلیم و تعلم کا ہی ذکر ہے۔ کوئی ایسا قانون و آئین نہیں ملے گا کہ جس میں ابتدا ہی سے دانش و معرفت کے لئے اس درجہ مخصوص توجہ دی گئی ہو۔ اگر محمدؐ ایک دانشمند ہوتے تو غارِ حرا میں نزولِ قرآن کا مسئلہ اتنا تعجب خیز نہ ہوتا جتنا کہ اس وقت ہوا کہ آپ امی تھے کیونکہ دانشمند قدرِ دانش کو جانتا ہے۔ لیکن وہ اُمی تھے کسی استاد کے پاس نہیں گئے تھے۔ میں مسلمانوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ابتدائے دین میں کسبِ معرفت کی اس قدر اہمیت بتائی گئی ہے (۱)

ڈاکٹر واگلیری نابل یونیورسٹی کے استاد اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں: اسلام کی آسمانی کتاب اعجاز آمیز ہے اس کی تقلید نہیں کیجا سکتی ادبیاتِ عرب میں اس کا اسلوب و طریقہ اچھوتا ہے۔ آدمی کے روح میں اتر جانے والی تاثیر اس کی امتیاز و برتری کی وجہ سے ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ کتاب محمدؐ کا کارنامہ ہو جبکہ وہ خود ایک ناخواندہ عرب تھے۔

اس کتاب کے اندر دانش کے ایسے گنجینے موجود ہیں جو بزرگ ترین فلسفیوں اور سیاستمداروں کے ہوش سے بلند ہیں اور اسی لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن تو ایک بہت پڑھے لکھے آدمی کا بھی کام نہیں ہے۔ (۲)

بورس ورث امیت اپنی کتاب "محمدؐ و مسلمانی" میں تحریر کرتا ہے میں بڑے کمالِ جرأت کے ساتھ ایمان رکھتا ہوں کہ ایک دن عالی ترین فلسفہ و دانشِ انسانی اور صادق ترین اصولِ مسیحیت اس بات کی گواہی دیں گے اور ایمان لائیں گے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور محمد (ص) اللہ کے رسول ہیں۔

۱۔ محمدؐ پیغمبری کہ از نو باید شناخت ص ۵۲ ۲۔ پیشرفت سریع اسلام ص ۹۴

جی ہاں ۔ درس ناخواندہ اور مکتب ندیدہ رسول خدا کی طرف سے منتخب کیا گیا اور قرآن جیسی کتاب لایا اس کتاب نے اس لمبی تاریخ کے اندر لاکھوں رسالے اور کتابیں موجود کر دیں ۔ کتب خانہ بنا دیے ۔ کتابوں کا ڈھیر لگا دیا اور فلسفہ ، حقوق تربیتی نظام اور فکری نظام ، آئیڈیالوجی اور مبانی و اصول و معارف لوگوں کے حوالہ کر دیا۔

اسلام کا طلوع ایک ایسے معاشرہ میں ہوا جو دانش و تمدن کو جانتے نہ تھے پورے مدینہ کے اندر صرف گیارہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور قریش جیسے شاخ در شاخ بزرگ قبیلہ کے اندر جو مکہ اور اطراف مکہ میں چھائے تھے ۔ صرف سترہ باسواد آدمی موجود تھے ۔

قرآنی تعلیم جو پہلی ہی آیات میں علم و قلم کا تذکرہ کرتی ہے ۔ اس نے اس سلسلہ میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا ۔ اسلام کے رو سے علم کا حاصل کرنا ایک فریضہ قرار دیا گیا ۔ اور یہی نہیں بلکہ دانشمندوں اور لکھنے والوں کی روشنائی کو اسلام نے شہیدوں کے خون سے برتر قرار دیا ۔

تعلیمات قرآن کے طفیل میں اور علوم و معارف قرآنی کی توجیہ کے سلسلہ میں بے شمار علما ظاہر ہوئے ، بے شمار کتابیں لکھی گئیں ، مختلف علمی رشتوں نے قرآن سے مایہ حاصل کیا اور اسلامی مفکرین کے ذریعہ تمام دنیا میں وہ چیزیں نشر ہو گئیں اور دنیا نور قرآن اور اسلامی معاشرہ کے طفیل میں روشن ہو گئی۔

دانش نو سے قرآنی رابطہ

مختلف زاویہ سے قرآن کی اہمیت کی تحقیق کی ضرورت ہے مثلاً ایک زاویہ الفاظ وزیبائی و ہنری ہے کہ اس کا اسلوب نہ تو شعر ہے اور نہ نثر۔ نہ اس میں شعری خصوصیت ہے کہ تخیل و مبالغہ اغراق آمیز ہو اور نہ معمولی نثر ہے۔ کیونکہ معنوی و روحانی جذبہ کے ساتھ ایک ایسا مخصوص تناسب ہے کہ جو شخص بھی قرآن کی زبان سے واقف ہو اس کا بے پناہ متاثر ہونا ضروری ہے۔

اب رہا فکری و علمی زاویہ تو اگرچہ قرآن کا مقصد علمی تحقیقات اور نظام ہستی میں ہونے والے حوادث و امور اور تمام طبیعی حرکات جو ایک مخصوص نظام کے ماتحت جاری ہوتے ہیں ان کی خصوصیات اور ان کے تاثیرات کی نشاندہی نہیں ہے۔ اور نہ یہ خیال کرنا چاہیئے کہ قرآن مختلف علوم وفنون کو بیان کرے گا اور جو مسائل اس قسم کے موضوعات سے مرتبط ہیں ان کی تحقیق کریگا اور تحقیق وجستجو سے مختلف و متنوع مشکلات کو حل کرے گا۔ کیونکہ علمی تحقیقات کے تجربہ کی طاقت انسانی فطرت میں ذخیرہ کر دی گئی ہے اور وہ اپنے افکار کے زیر سایہ دانش و فنونِ زندگی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور عوامل طبیعی کے تسلط کے راستہ پر اپنی مسلسل تلاش وجستجو کے ساتھ آگے قدم بڑھا سکتا ہے۔ اور ان سب باتوں کے علاوہ ایک تربیتی کتاب کے مقصد سے باہر کی یہ چیزیں ہیں۔

قرآن کا مقصد انسان کو اسطرح تربیت دینا ہے کہ وہ اپنے وظیفہ کو

پہچان کر روحانی بلندیوں کی طرف مائل ہو اور اس کی تکامل آفرین حرکت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ بلند و دانشمند انسان کی پیدائش میں تقویت کا سبب ہو۔

قرآن چاہتا ہے کہ انسان کی ہر لحاظ سے اصلاح ہو جائے اور لچر و پوچ معیار جو زمانۂ جاہلیت نے اپنا رکھے ہیں ان سے دور ہو جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نیروئے زائندہ و سخت کوشش کی تربیت و تدارک کرے کہ اس خطِ سیر میں قرآن روحِ انسان کو گداختہ کر کے ایک دوسرے قالب میں ڈھال دیتا ہے اور اس نئی ترکیب کو گراں قدر و پُر محتویٰ بنا دیتا ہے۔

اس حال میں قرآن بشر کو اصرار کے ساتھ تامل و ادراک و واقع بینی کی طرف دعوت دیتا ہے تاکہ اس کو اندیشہ و تعلیم و تعلم کے راستہ پہ لے آئے۔

قرآن کی ابتدائی آیات میں قلم و دانش اندوزی و مطالعۂ فطرت ــــ جو خود معرفت کے طاقتور منابع میں سے ایک منبع ہے ــــ کی بہت ہی تعظیم و تعریف کی گئی ہے۔ اور الہاماتِ قرآنی کی روشنی میں اور اسلام کی نہضتِ علمی میں، ماورائے طبیعت کے سرحدوں تک کی عمیق شناخت نے ایک پرجوش و دانشمند ملت کو پیدا کیا اور اسلام کا یہی نظریہ ایک عظیم تحول تھا جس نے دیگر انقلابات کے راستے کھول دیئے۔

۵

علامہ اقبالؒ لاہوری فرماتے ہیں:

ظہور و ولادتِ اسلام گویا ظہور و ولادتِ عقلِ برہانی و استقرائی ہے۔ قرآن کے اندر عقل و تجربہ کی طرف دائمی توجہ اور دینِ مبین کی طبیعت و تاریخ کی طرف بعنوان منابع معرفتِ بشری اہمیت دینا، یہ سب ختم دورۂ رسالت کی نشانیاں ہیں۔ ــــ باطنی تجربہ تنہا ایک معرفتِ بشری کا منبع ہے اور ــــ بدلولِ قرآن معرفت کے

دوسرے چشمے اور بھی ہیں ایک تاریخ دوسرا عالم طبیعت اور اگران دونوں سرچشموں میں کاوش کی جائے تو روح اسلام بہترین صورت سے واضح ہو جائیگی۔(۱)

ہر قسم کی کوشش اور عقل ورشد انسانیت کی بزرگی کو تسلیم کرتے ہوئے تلاش علمی، آزادی فکر اور رشد علوم طبیعی اسی راہ وروش کا مدیون ہے۔

قرآن مجید بزرگ تربیتی مقصد بیان کرنے کے ساتھ ضمناً موقع وضرورت کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے بشری معارف بھی بیان کرتا ہے۔ اور اس نے جہانِ ہستی کے جن اسرار کو اپنے اندر منعکس کیا ہے ان کو نہ تو زمانِ نزولِ قرآن کے اطلاعات کا محصول کہا جا سکتا ہے اور نہ ان کو تصادف کا معلول سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ معارفِ قرآنی بشری معلومات کے وسیع دائرہ کے مقابلہ میں زیادہ درخشان طریقہ سے متجلی ہیں جس کے انعکاس کو مختلف علمی میدانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عصرِ حاضر میں انسان لاکھوں ان مفکرین ودانشمندوں کی تحقیقات کا وارث ہے کہ جنھوں نے بڑی کدوکاوش سے علمی مبانی کو دریافت کیا ہے اور ذہنی تخلیق وابتکار کے ذریعہ ان کو حاصل کیا ہے اور بڑی زحمتوں کے ساتھ اسرارِ ہستی تک دستیابی کا راستہ کھولا ہے۔

لیکن نزولِ قرآن کا زمانہ بے دانشی وجاہلیت کے دور سے مشہور ہے اس وقت افکارِ ابتکار وعلمی جامعیت کا کوئی وجود نہیں تھا اور کسی بھی فرد بشر کے لئے رازہائے ہستی کا شناخت کرلینا ناممکن تھا۔

مگر قرآن نے اس دور میں بھی اس راز سے پردہ اٹھایا ہے البتہ جس جگہ صراحت پسندیدہ ومطلوب ہے وہاں تصریح کے ساتھ اسرارِ آفرینش کو بیان کیا ہے۔

۱۔ احیائے فکر دینی در اسلام ص ۱۴۶

اور جہاں پر اس زمانہ کے لوگوں کے لئے درک حقائق پیچیدہ و دشوار تھا انکو اشاروں اور کنایوں میں بیان کیا ہے تاکہ جب بشر کی دانش و خرد رشد و کمال کی منزل تک پہنچے اور اسرار طبیعت فرد و تحلیل کی منزل تک پہونچے تو یہ مسائل قابل ادراک ہو جائیں۔

۵

اسلامی محققین قرآن کی ثروت معنوی کے وسعت کے پیش نظر تحقیق و جستجو اندیشہ و تفکر کے زیر سایہ ہر روز نئی نئی باتوں کا انکشاف کرتے رہتے ہیں کیونکہ قرآن میں اتنا غنائے معنوی ہے کہ جسکی بناپر ہرگز ہرگز یہ یقین نہیں آتا کہ ایسا عظیم و بے پایاں منبع فکر انسانی کے استعداد و سرمایہ سے وابستہ ہو۔ اگر معجزات علل طبیعی کی وجہ سے کوئی صورت عملی ہو تب تو یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ خود اس زمانہ میں یا آئندہ کسی زمانہ میں کچھ افراد اس کے مشابہ پر اقدام کر سکے۔ لیکن اگر خارج از مجرائے طبیعی نادر طور سے تجلی کرے اور قوانین و موازین طبیعی جہاں درہم و برہم ہو جائیں وہاں پر عموماً لوگ عاجز و ناتوان رہتے ہیں۔

قرآن کا مسئلہ کچھ اسی طرح کا ہے کہ وہاں تمام اصول و موازین نے دم توڑ دیئے ہیں۔ اور یہ پوری کتاب بالکلیہ خرق عادت ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا کہ حقائق علمی کی طرف قرآن کا اشارہ بعنوان مسائل فرعی اور بطور مقدماتی ہوتا ہے اسلئے شکوہ مند و بزرگ مقصد تک پہنچنے کے لئے اسکو ایک فنی کتاب کی حیثیت سے جس میں صرف علمی مسائل پیش کئے جاتے ہیں نہیں رکھنا چاہیئے۔

قرآن کے اندر کچھ رازہائے ہستی، انسان، زمین، آسمان، گھاس (وغیرہ) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس سے یہ خیال کر لینا کہ اس کا مقصد علوم طبیعی

پیش کرنا اور اس سے متعلق ابہامات کو دور کرنا ہے یہ بالکل بے بنیاد سی بات ہے بلکہ قرآن کا مقصد اس سلسلہ میں صرف اتنا ہے کہ ان حقائق کو بیان کر دیا جائے جو حیات معنوی اور رفعت و ارتقاء انسان سے وابستگی رکھتے ہیں اور انسان کی سعادت بخش زندگی تک پہونچاتے ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن علمی حقائق کو اس طرح بیان کرتا ہے جو ہر زمانے کے علمی اصطلاحات کے قالب میں ڈھل سکیں وہ کسی مخصوص فن کے اصطلاح کو استعمال نہیں کرتا۔ کیونکہ علمی حقائق اور موجودات پر حاکم قوانین دائمی ہیں وہ ابتدا سے ہیں اور ابد تک رہیں گے۔ لیکن علمی اصطلاحات کا ہر زمانہ میں متغیر ہو جانا ممکن ہے اور نئے قالب میں ڈھل جانا ممکن ہے اسی لئے قرآن کسی مخصوص فن کے اصطلاح کو استعمال نہیں کرتا۔

جہانِ آفرینش کے سلسلے میں قرآن ان حقائق سے بحث کرتا ہے جو افق حس میں برقرار نہیں رہتے صرف علمی وسائل اور مخصوص آگاہی کے ذریعہ انسان ان امور کے ادراک پر قادر ہو سکتا ہے۔

۵

ڈاکٹر موریس بوکائی مغربی دانشمند تحریر کرتے ہیں:

اہم اور اصلی چیز یہ ہے کہ قرآن جو برابر لوگوں کو تربیتِ دانش کی طرف دعوت دیتا ہے وہ فطری حوادث کے سلسلہ میں متعدد نظریات پر مشتمل ہے جو تفصیلی بھی ہیں اور علم جدید سے مکمل طور پر موافق بھی ہیں۔ حالانکہ دین یہودی اور عیسائی میں جو اصول دین وحی شدہ ہیں ان میں ان نظریات کا معادل موجود نہیں ہے ___ اور قرآن کے نظریات مخصوص طور پر ابتدا ہی سے بہت گہرے اور موجب تعجب ہیں۔ کیونکہ جو کتاب تیرہ سو سال پہلے لکھی گئی ہو اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا

کہ بے انتہا متنوع موضوعات کے سلسلہ میں اس قدر تائیدات ملیں گے جو مکمل طور سے دانش جدید کے تجربوں سے ہم آہنگ ہوں۔

ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن شناسی کے لئے صرف عمیق زبان شناسی کے معلومات ہرگز کافی نہیں ہیں بلکہ زبان شناسی کے علاوہ بہت ہی متنوع علمی اطلاعات کا حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ اور اس قسم کے تحقیق چند دانش سے مربوط ہے۔ بلکہ اس کو خود ایک قسم کا انسائیکلوپیڈیا ہونا چاہیئے۔

تدبر کی ملاحظہ کے وقت قرآن میں جو مطالب پیش کئے گئے ہیں انہیں بعض آیات کے معنی کے ادراک کے لئے مختلف علمی شناخت کی ضرورت ہے اس کا اندازہ آپکو خود ہو جائیگا۔

اس کے باوجود قرآن کوئی ایسی کتاب نہیں ہے کہ جس کا مقصد صرف چند ان قوانین کا اثبات ہو جو کائنات پر حاکم ہیں۔ بلکہ قرآن بنیادی طور سے ایک دینی ہدف رکھتا ہے۔ خصوصاً پروردگار عالم کی قدرتِ مطلقہ کا جہاں جہاں ذکر ہے اسس میں انسانوں کو کارہائے آفرینش میں تفکر کے لئے دعوت دی گئی ہے۔

یہ دعوت فکر تمام ان نمودہائے فطرت میں جو انسانی دسترس میں ہیں اشارہ کے ساتھ دی گئی ہے یا خداوند عالم کی طرف سے وہ بیان شدہ قوانین جو سازمانِ جہان پر حکومت کرتے ہیں ان کے ساتھ ہیں۔ ان تصریحات کی بنا پر ایک حصۂ قرآن کا سمجھنا آسان ہے لیکن دوسرے حصہ کا سمجھنا بغیر ضروری علمی شناخت کی ہمراہی کے ناممکن ہے۔

ایک ایسا شخص جس نے شروع ہی سے درس نہ پڑھا ہو اس کے لئے کیونکر ممکن ہے کہ ایک ایسی کتاب پیش کردے جو تمام ادبیات عرب پر برتر ہونے کے علاوہ اس میں علمی حقائق بھی موجود ہوں۔ اور ایسے حقائق کہ اس زمانہ کے انسان

کے لئے ان کا تصور تک ممکن نہ ہو۔ اور پھر اس طرح بیان کرنا کہ اس میں ذرہ برابر اشتباہ وخطا نہ ہو (ایسا ممکن ہی نہیں ہے تا بخشد خدائے بخشندہ۔ مترجم)

یہ کہنا کہ جو شخص ساتویں صدی عیسوی میں زندہ ہو اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ اپنی طرف سے بالکل متضاد موضوعات پر قرآن کے اندر ایک ایسا آئیڈیا پیش کر دے جو اس زمانہ کی چیز نہ ہو بلکہ صدیوں بعد جو حقائق ثابت ہونگے ان کے عین مطابق ہو ______ بالکل غلط ہے ___ ملاحظات وتحقیقات اس دعویٰ کی تردید کرتے ہیں میری نظر میں کسی بشر کی ایسی کوئی تقریر قرآن کے اندر ہرگز بھی نہیں ہے (۱)

لیجئے اس قسم کے بعض مسائل کو ہم بطور فشردہ بیان کر رہے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو اس بات کا اندازہ ہو سکے۔ اور قرآن کی اہمیت معلوم ہو سکے۔

۱

منظومۂ شمسی کی پیدائش کے سلسلہ میں مشہورترین نظریہ مفروضۂ (لاپلاس) ہے جس کو بعد کے محققین نے رد کیا ہے یعنی اس کے بعض نظریات کو رد کیا ہے۔

منظومۂ شمسی کے پیدائش کے سلسلے میں اور بھی اقوال ہیں۔ لیکن ان کرات کی اصل پیدائش گاز "سدیم" کے تودہ سے ہوا اور یہ کہ تمام آسمان وزمین ایک قطعہ اور متصل تھے اس کے بعد ان میں جدائی ہوئی ہے یہ بات دنیائے امروز کے تمام علمی حلقوں میں مسلّم ہے۔

صدیوں پہلے قرآن نے بھی اس علمی نظریہ کو عنوان بنایا تھا اور جہاں پر آسمان وز...

۱۔ توریت، انجیل، قرآن، علم ص ۱۹۸، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۹

کی خلقت کی کیفیت بیان کرتا ہے وہاں ارشاد ہوتا ہے:

اس کے بعد خداوند عالم نے آسمانوں (کرات) کو پیدا کیا حالانکہ وہ اس وقت دھوئیں کے مانند تھے۔ (۱)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

کیا کفار یہ نہیں سوچتے کہ آسمان و زمین باہم متصل تھے اور ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ موجود کو پیدا کیا۔ پھر یہ لوگ خدا پر کیوں ایمان نہیں لاتے۔ (۲)

مشہور امریکی دانشمند ژرژ گاموف لکھتا ہے:

سب ہی جانتے ہیں کہ سورج گازہائے قابل تراکم سے پیدا ہوا ہے اور اسی سورج نے گاز کے ایک حصہ کو اپنے سے باہر پھینک دیا جس کے ٹوٹنے سے سیاروں کا وجود ہوا۔ لیکن یہ جلتا ہوا تو وہ کس طرح موجود ہوا؟ اور کس ہستی نے اور کس قوت نے اسکو پیدا کیا؟ اور اسکے بنانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی ان کو کس نے فراہم کیا؟ یہ وہ سوالات ہیں جو کرۂ ماہ بلکہ منظومۂ شمسی کے ہر سیارہ کے لئے ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہی پایۂ اصلی عالم کی تھیوریوں (جہاں شناسی) کو تشکیل دیتے ہیں اور یہ وہ معمے ہیں جنھوں نے علمائے ہیئت کو صدیوں تک اپنے میں مشغول رکھا ہے۔ (۳)

جینز JEANS انگریزی دانشمند لکھتا ہے:

اربوں سال پہلے ایک ستارہ سورج کے قریب سے ہو کر گزرا جس کی وجہ سے ایک مد مہیب پیدا ہوا اور سورج سے سیگریٹ کی طرح بہت لمبا

۱۔ سورۂ فصلت آیت ۱۰ ۲۔ سورۂ انبیاء آیت ۲۹ ۳۔ سرگذشت زمین ص ۴۴

ایک مادہ جدا ہوا پھر وہ مادہ منقسم ہو گیا جو حصہ موٹا تھا اس سے بڑے بڑے سیارے پیدا ہوئے اور جو حصہ باریک تھا اس سے چھوٹے چھوٹے سیارے پیدا ہوئے۔(۱)

۵

پہلی والی آیت میں آسمانوں کی پیدائش کے سلسلہ میں قرآن نے ان کے مبدأ کو (دھواں) یعنی گاز سے نسبت دی ہے۔ اس سے اس کی گہرائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ سدیم ایک ایسا گاز ہے جو مواد آہنی سے مخلوط ہوتا ہے اور لفظ گاز، گاز اور آہن دونوں کو شامل ہوتا ہے اور سب سے بہتر علمی تعبیر جو اس موقع پر کی جا سکتی ہے وہ لفظ دُخان (دھواں) ہی ہے جس سے قرآن نے تعبیر کیا ہے۔

جس زمانہ میں قرآن نازل ہوا ہے اس وقت بشر کی سطح دانش وافکار بہت ہی پست تھی اس وقت یہ مسئلہ پیش کرنا کہ ایک عظیم جسم (سورج) سے سیارات کا جدا ہونا اور پھر ان کا آپس میں ایکدوسرے سے جدا ہو جانا اور فطرت کے اس عظیم راز سے پردہ اُٹھانا کیا قرآن کے آسمانی ہونے کی دلیل نہیں ہے؟ ان رازوں کا بیان کرنا اور فلکی محققین کی تحقیقات سے اس کا موافق ہونا ـــــ جبکہ ان رازوں سے پردہ ہٹے ہوئے زیادہ مدت نہیں گذری ـــــ کیا اس بات کے اثبات کے لئے کافی نہیں ہے کہ اس کا بیان کرنے والا ہستی کے تمام حقائق واسرار سے واقف ہے!

ڈاکٹر بوکائی علم و تکنیک کی دنیا کا ماہر صریحی طور سے اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے:

۱۔ نجوم بے ٹیلسکوپ ص ۸۲

قدیم‌ترین زمانہ سے ـــــ جس کے بارے میں علم جدید اظہار عقیدہ کی قابلیت رکھتا ہے ـــــ یہ نظریہ موجود ہے کہ کائنات ایک گاز کے جرم سے سست رفتاری سے پیدا ہوئی ہے۔ اس گاز کا اصلی جز ہائیڈروجن اور باقی ہلیوم ہے (۱) اس کے بعد یہ بادل متعدد ٹکڑوں میں ابعاد و اجرام قابل ملاحظہ کے ساتھ تقسیم ہو گیا۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ نجومی جو فیزیک دان ـــــ فیزیک وہ علم ہے جو صرف جسم طبیعی کے بارے میں بحث کرتا ہے ـــــ سمجھتے ہیں وہ ان کو ایک ملیار سے لے کر سو ملیارد جسم خورشید کے برابر اندازہ کرتے ہیں۔ جسم گاز کے یہ ٹکڑے جو تھوڑی دیر بعد کہکشاؤں کو تولید کرتے ہیں۔ ان کی عظمت و اہمیت کا اندازہ بیان شدہ ارقام سے کیا جا سکتا ہے ـــــ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ـــــ جیسا کہ سورۂ سجدہ کے آیات ۹ تا ۱۱ میں بیان کیا گیا ہے ـــــ اجسام آسمانی اور اسی طرح زمین کی تکوین کے لئے دو مرحلے ضروری تھے۔ دانش نے ہم کو یہ سکھایا ہے: چنانچہ محض من باب المثال خورشید کی تکوین اور اس کی فرع زمین کو اگر پیش نظر رکھیں، تو پتہ چلیگا کہ تراکم سحابی کے واسطہ سے پہلا مرحلہ اسکی تفکیک ہے۔ اور اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو یہی وہ بات ہے جس کو قرآن نے صریحی طور سے بیان کیا ہے کہ دھوئیں نے ابتدأ ایک قسم کے الصاق کو اس کے بعد ایک قسم کے انفکاک کو جنم دیا ہے۔

اس (دھوئیں) کے وجود کی تصدیق میں جس کو قرآن ابتدائی مرحلہ میں تشکیل دہندۂ کائنات کہتا ہے اور علم جدید کی بنا پر جس کو پہلا سحاب کہا جاتا ہے کوئی مغایرت نہیں ہے بلکہ تناسب و ارتباط و انطباق برقرار ہے۔

۱۔ ہلیوم ایک قسم کا گاز ہے جس کے بارے میں تحقیق ہوئی ہے کہ وہ فضائے خورشید میں ہے۔ مترجم

آفرینش کائنات کے سلسلہ میں جس کو چودہ سو سال پہلے قرآن نے بیان کیا ہے ۔ ممکن نہیں ہے کہ اسکو کسی انسان کا کرشمہ مانا جائے (۱) بلکہ یہ خدائے قدوس کا بیان کردہ ہے ۔

۲

اسی طرح منجملہ دیگر مسائل کے ایک علمی دقیق مسئلہ وسعت کائنات کا ہے جو آخری صدی تک بشر کے لئے مجہول تھا ۔ لیکن قرآن نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے :

ہم نے آسمانوں کو اپنی قدرت و توانائی سے پیدا کیا ہے اور ان کو ہمیشہ وسعت و گسترش دیتے ہیں ۔ (۲)

اس آیت میں یقینی طور سے کائنات کی وسعت ، بادلوں ، کہکشاؤں کا تذکرہ آیا ہے حالانکہ کشفِ وسعتِ کائنات کی تاریخ سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے مغربی دانشمند لینکلن بارنٹ لکھتا ہے :

رفتہ رفتہ علمائے ہیئت اس بات کی طرف متوجہ ہوئے کہ بہت دور کی کہکشائیں جو نجومی دوربینوں سے بھی بہت آخر میں دکھائی دیتی ہیں ان کے اندر ایک منتظم قسم کی حرکت موجود ہے ۔ اور یہ دور والی کہکشائیں بظاہر نظام شمسی سے اور ایکدوسرے سے بھی دور ہو رہی ہیں ۔

۱۔ توریت ، انجیل ، قرآن و علم ص ۲۰۹ ۔ ۲۰۲ ۔ ۲۰۲ ۲۔ سورۂ ذاریات آیت ۴۷

ان کہکشاؤں میں جو نزدیک ترین ہیں وہ بھی ہم سے پانچ سو نوری سال کے فاصلہ پر ہیں ۔ یہ سب بہت ہی آرام سے قوت جاذبہ کے ماتحت تھوڑا تفاوت رکھتی ہیں اور ممکن ہے کہ یہ منتظم حرکات انحنار کائنات میں کچھ تاثیر بھی رکھتی ہوں لیں کائنات سکون و تعادل کی حالت میں نہیں ہے ۔ بلکہ صابن کے بلبلے یا یادکسنگ کی طرح بڑھتی ہو رہی ہے ۔

اور چونکہ یہ کہکشائیں مسلسل ایکدوسرے سے اور ہم سے بھی دور ہوتی جا رہی ہیں اس لئے فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس بوڑھی دنیا کی زندگی میں کسی زمانہ میں سب ایکدوسرے کے ساتھ جمع ہونگی اور ایک تودہ سوزانی کی تشکیل کرتی ہوں گی۔ (۱)

جان قفز بھی لکھتا ہے :

کائنات حالت انبساط میں ہے ۔ ہم جس طرف بھی نظر کرتے ہیں دیکھتے ہیں کہ کہکشائیں ایکدوسرے سے دور ہوتی جا رہی ہیں ۔ اُن کے درمیان کا فاصلہ ہر وقت بڑھتا جا رہا ہے اور دور ترین والی کہکشائیں تند ترین سرعت کے ساتھ ہم سے دور ہو رہی ہیں ۔ مثلاً بعض کہکشاؤں کا عالم یہ ہے کہ جتنی دیر میں آپ ایک جملہ پڑھیں گے اتنی دیر میں وہ زمین سے دو لاکھ میل اور دور ہو چکی ہونگی۔

پوری کائنات دور ہو رہی ہے جیسے کوئی گلولہ ہوا کے بیچ میں پھٹ جائے اور کہکشائیں اس کے ٹکڑے ہوں کہ فوراً ہی بہت جلد دور ہو جائیں گے درحقیقت انفجار عظیم کی تھیوری اسی مفروضہ پر قائم ہے ۔

اس تھیوری کے حساب سے ایک زمانہ ایسا تھا کہ جب تمام مادۂ جہاں

۱۔ جہان و آینسٹائن ص ۱۱۳

اکٹھا ہوگیا تھا اور اس سے ایک بہت ہی متراکم جسم موجود ہوگیا تھا۔ ایک معدن تھا جو فضا میں ایک ایسے جسم سے متعلق تھا جو سورج سے سیکڑوں گنا بڑا تھا یا پھر ایسا بم تھا جو پھٹنے کے لئے تیار تھا۔ اس وقت دس بلیون سال پہلے ایک چکاچوند کردینے والی صورت میں وہ پھٹ گیا اور اس عظیم تودہ کے پھٹنے کی وجہ سے فضا میں ایک مادہ منتشر ہوگیا۔ جو اب تک گاز اور چکاچوند کردینے والی صورت، اور کہکشاؤں کی صورت میں کائنات کے اندر بڑی سرعت کے ساتھ حالت انبساط میں دور ہو رہا ہے (۱)

قرآن مجید انسانوں کے افکار اور آگہی توجہ کو نظم جہان کی عظمت اور خلقت کی پیچیدگی کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ اور یاد دلا رہا ہے کہ صنعت پروردگار کی نشانیاں آفرینش ہستی میں اتنی زیادہ ہیں کہ بشر اگر صحیح طریقہ سے غور کرے تو مبدأ ہستی اور قدرت لایزال الہٰی پر ایمان لائے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اور اس کے اقتدار کے سامنے سرنگوں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

یقیناً زمین و آسمان کی پیدائش، شب و روز کی آمد و رفت عقلمندوں کے لئے روشن دلائل ہیں۔ جو لوگ ہر حالت میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور ہمیشہ زمین و آسمان کی خلقت کی طرف متوجہ ہو کر کہتے ہیں: پروردگارا! اس پرشکوہ و جلال دستگاہ کو تو نے بے کار نہیں پیدا کیا تو پاک و منزہ ہے۔ ہم کو اپنے لطف و کرم کے طفیل عذاب دوزخ سے نجات دے۔ (۲)

۳

۱۔ از کہکشان تا انسان ص ۴۷ ۲۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۹۰، ۱۹۱

اس سلسلہ میں کہ آسمانی کرات اپنے مدارِ خاص میں مقرر کئے گئے ہیں قرآن کا اعلان ہے:

خدا نے آسمانی کروں کو ان دیکھے ستونوں پر بلند کیا اسکے بعد عرش پر غالب آیا اور چاند و سورج کو تمہارا تابع بنایا ان میں سے ہر ایک ایک مدت تک اپنی گردش کو جاری رکھتے ہیں۔ خدا جہانِ ہستی کے امور کی تدبیر کرتا ہے اور اپنی نشانیوں کی تمہارے لئے تشریح کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ روز قیامت اور لقائے الٰہی پر یقین پیدا کرو۔ (۱)

یہ سب جانتے ہیں کہ نیوٹن (جو دنیا کی ایک معروف شخصیت ہے۔) سے پہلے کوئی جاذبہ عمومی کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ اگرچہ مختلف علوم کے سلسلہ میں نیوٹن نے بہت سے انکشافات کئے ہیں لیکن جاذبہ عمومی کی تحقیق نے اس کو عالمی شہرت کا مالک بنادیا۔ نیوٹن کے سلسلہ میں لوگ لکھتے ہیں: نیوٹن نے یہ بات ثابت کردی کہ اجسام کا زمین پر گرنا، چاند، سورج، مشتری اور سیاروں کی حرکات سب کے سب ایک ہی قانون کے تابع ہیں یعنی قوتِ جاذبہ عمومی۔

نیوٹن جن مشکل مسائل سے دو چار تھا ان میں ایک مسئلہ یہ تھا کہ قوتِ جاذبہ ایک جسم کروی کے وسیلہ سے عمل میں آتی ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ اس کے تمام جسم کو مرکزِ کرہ میں گڑا ہوا فرض کریں۔ اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو جائے قوتِ جاذبہ عمومی کا نظریہ دقیق حسابات اور برہان ریاضی کی بنیاد پر ثابت ہونے سے زیادہ ایک قسم کے الہام و مکاشفہ پر مبنی رہے گا۔ (۲)

اوپر والی آیت میں کراتِ آسمانی کا فضا میں قرار پکڑنا اور وہ گردش جو ان کے مدار میں ہوتی ہے اسکی نسبت نامرئی ستونوں کی طرف دی گئی ہے۔ یہاں دیکھے ستون

۱۔ سورہ رعد آیت ۲ ۲۔ دانشمندانِ بزرگ جہانِ علم ص ۹۴

جو کرات کو ٹکراؤ اور گرنے سے روکتے ہیں کیا یہ قوت جاذبۂ عمومی کے علاوہ کچھ اور ہیں؟ کہ جن کو خدا نے آسمانی کرات کے لئے مقرر کیا ہے؟

قرآن اس حقیقتِ علمی کے پہونچانے میں ایسی تعبیر استعمال کرتا ہے جو ہر زمانہ کے انسان کے لئے قابلِ ادراک ہے۔

امام ہشتم (ع) نے اپنے اصحاب میں سے ایک سے فرمایا:

کیا خدا نے قرآن میں یہ نہیں فرمایا کہ ایسے ستونوں کے ساتھ بلند کیا جن کو تم نہیں دیکھ سکتے؟ اس نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ اس پر امام (ع) نے اضافہ فرمایا:

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ستون ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔ (۱)

۲

مادی حضرات کا نظریہ جو انسان کے فنا اور نابودی پر مبنی ہے قرآن اسکو باطل کرتے ہوئے کائنات کی حرکتِ تکاملی کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

آیا یہ منکرین فراز آسمان کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے کس طرح محکم بنیاد پر اس کو قائم کیا ہے اور ستاروں سے (کس طرح) آراستہ کیا ہے کہ جس میں کسی قسم کا خلل نہیں ہے کیا ہم کائنات کی تخلیقِ اول سے عاجز ہو گئے تھے؟ (تاکہ دوبارہ تخلیق سے تنگی محسوس کریں) بلکہ خود یہ لوگ (منکرین) ہر وقت آفرینش کی نئی پوشش میں ہیں (۲)

یعنی جو لوگ کائنات کو اپنی کوتاہ بینی اور تنگ نظری کی بنا پر حالتِ توقف و سکون

۱۔ تفسیر برہان ج ۲ ص ۲۸۷ ۲۔ سورۂ ق آیات ۵، ۷، ۱۵

میں خیال کرتے ہیں وہ صریحی اشتباہ میں ہیں بلکہ خود وہ لوگ اور یہ کائنات مسلسل حرکت میں ہے۔ کائنات کی عمومی حرکت انسان کی حرکت سے پیوستہ ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی جب تک روز موعود متحقق نہ ہو اور وعدہ گاہ الٰہی پہ پہونچ جائے انسان کی روحانی حرکت ممتد رہتی ہے۔ اور موت کے ساتھ وہ حرکت توقف پذیر نہیں ہو جایا کرتی۔

قرآن اس دقیق علمی مسئلہ کو صرف فلسفہ کے جنبہ ہائے خشک کے حوالہ نہیں کرتا بلکہ اس شگفت انگیز مسئلہ کو ایک تاریک معاشرہ میں رہنے والے اور فلسفہ کی تاریخ سے سابقہ نہ رکھنے والے ایک درس نخواندہ شخص کی طرف سے اسکی حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ جو انسانوں کے لئے جنبۂ حیاتی رکھتا ہے اور وہ مسئلہ بقائے روح اور وجود رستاخیز و حساب رسی کا مسئلہ ہے اور آخر کار انسانی مسئولیتوں کا بیان صحنۂ زندگی کے اندر ہے۔

اسی طرح قرآن زمین کی اندرونی حرکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے:

کیا تم پہاڑوں کو نہیں دیکھتے؟ تم خیال کرتے ہو کہ یہ جامد و ساکن ہیں (نہیں نہیں) یہ بادل کی طرح اندرونی حرکت میں ہیں یہ آفرینش الٰہی اور حرکت درونی سازندگی اور صنع خدا ہے، کہ جس نے صحیح اسلوب سے ہر چیز کو بنایا ہے اور وہ تمہارے اعمال و رفتار سے آگاہ ہے۔ (۱)

اوپر والی آیت پہاڑوں کی ڈائنامیکی اور اندرونی حرکت کو بتاتی ہے کہ اگرچہ تمہارا خیال ہے کہ پہاڑ جامد اور بے حرکت اور رشد درونی کے بغیر ہیں۔ لیکن حقیقت حال یہ نہیں ہے۔ یہی پہاڑ جو بظاہر جامد اور بے حرکت ہیں بادلوں کی مانند (جو تمہارے لئے قابل رؤیت اور قابل احساس ہے) رشد درونی اور پیشروی کی حالت میں ہیں۔ اور ہر چیز کا

---

(۱) سورۂ نمل آیت ۹۰

استحکام و تحول اسی حرکت کے وسیلہ سے تحقق پذیر ہے اور یہ صنع و ساز ندگی خدا یعنی قانون حرکت فطرت کے تمام ظواہر اور اجزاء پر حاکم ہیں۔ اور سبب استحکام ہیں۔
اس تعبیر کا انتخاب ہو سکتا ہے قرآن نے پہاڑوں کے وزن و سنگینی و استحکام کی بنا پر کیا ہو تا کہ قدرت پروردگار کی تشریح کر سکے اور یہ کہ وہ کام کے انجام دینے پر قادر و توانا ہے۔

۵

باوجود اس کے کہ حرکت زمین کا نظریہ گالیلہ کے زمانہ سے کافی دلائل کے ساتھ دنیا نے علم پر پیش کیا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی تین قسرن سے زیادہ مدت نہیں گزری کہ زمین کی مرکزیت اور اس کے سکون کو مسلّم اصول کے بطور اور نا قابل تردید سمجھا جاتا تھا جس وقت گالیلہ نے یہ نظریہ پیش کیا ہے اس کو شدید نفرت و مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے ـــــ لیکن جاہلیت کے تاریک ترین دور میں قرآن نے زمین کی حرکت اور پہاڑوں کے اسرار سے پردہ اٹھایا تھا جو اس زمانہ کے لحاظ سے ایک بہت ہی پیچیدہ علمی حقیقت کا بیان تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

کیا ہم نے زمین کو تمہارے لئے گہوارہ نہیں قرار دیا اور پہاڑوں کو میخ کے مانند نہیں قرار دیا (۱)

دوسری جگہ اعلان ہوتا ہے:

خداوند عالم نے زمین میں پہاڑوں کو قرار دیا تا کہ اس کی ناموزوں حرکت کو

۱۔ سورۂ نباء آیت ۶۔ ۷

روکے رہے۔ (۱)

قرآن زمین کو گہوارہ سے تشبیہ دیتا ہے کیونکہ گہوارہ عین حالتِ حرکت میں بھی آرام کی جگہ ہے۔ دوسری آیت میں تشبیہ کو عوض کر دیتا ہے اور کہتا ہے:

زمین کو تمہارے لئے ہم نے اس اونٹ کی طرح پیدا کیا ہے جو مسلسل آہستہ حرکت کرتا ہے اور اپنے سوار کو تکلیف نہیں پہونچاتا اور اپنے مالک کیلئے رام و مطیع ہوتا ہے۔

قرآن نے زمین کی حرکت کا نظریہ اس وقت پیش کیا تھا جب تقریباً پندرہ قرنوں سے بطلیموس کا نظریۂ سکون و مرکزیتِ زمین تمام دانشمندوں کے افکار پر حکومت کرتا تھا ـــــ اور یہ صرف قرآن تھا جس نے گیارہ سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے نظریہ بطلیموس کو باطل قرار دیا تھا۔

اور اوپر والی آیت میں ایک اچھے پیرایہ سے پہاڑوں کو بمنزلۂ میخ پیش کر کے زمین کو پراگندگی سے بچانے کا ضامن قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نرم و لطیف قشر کو خاک و نرم ریگ سے زمین کو چھپایا ہے۔ اور اگر زمین پُر صلابت و سنگین پہاڑوں سے خالی ہوتی تو بے تردید کشش و جاذبۂ ماہ کے تحت تاثیر ہوتی اور اس کا ثبات درہم و برہم ہو جاتا اور وہ اضطراب و لرزش کی وجہ سے ختم ہو جاتی۔ ویران کرنے والے جزر و مد ہمارے اس کرۂ خاکی کو نیست و نابود کر دیتے۔

لیکن یہ میخوں کی طرح پہاڑوں کا وجود آسانی مقاومت سے ہے کہ زمین کو انہدام و متلاشی ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے باوجود ناآرامی یا معمولی سی لرزش اس حد تک نہیں ہے کہ انسانوں سے انکی آسائش و ثباتِ زندگی کو سلب کر لے

۱۔ سورۂ لقمان آیت ۱۰

اس کے علاوہ پُر صلابت عظیم پہاڑوں کا وجود، امواج شکستہ کی قوت، پگھلے ہوئے مادہ کا وجود زمین کے اندرونی گازوں کو بھی وسیع پیمانہ پر کنٹرول کرتا ہے۔ اور زمین کے اوپر سے پہاڑ سر نہ اٹھاتے تو ربع مسکون کی سطح ہمیشہ پگھلے ہوئے مادوں سے جنبش و تلاطم میں رہتی اور اس کا چہرہ دگرگوں ہو جاتا۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ پہاڑ بمنزلہ میخ ہیں۔ اس کرہ خاک سے پر سکون و آرام انہیں پہاڑوں کی برکت سے ہے۔

زمین کے کروی ہونے کا مسئلہ بھی قرآن نے بصورت کنایہ پیش کیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم۔ (۱)

یہ بات بدیہی ہے کہ جب مشرق و مغرب متعدد ہونگے تو زمین کروی ہوگی کیونکہ وہ اپنی حرکت وضعی کی بنا پر اپنے اردگرد مشرق و مغرب کی تعداد اور طلوع و غروب کے نقطے پیدا کرے گی۔ کیونکہ زمین کا ہر نقطہ ہر لحظہ ایک گروہ کے لئے مشرق ہوگا اور دوسروں کے لئے مغرب ہوگا۔

اب آپ ہی بتلائیے کیا یہ حقائق اس کتاب آسمانی کے ان عمیق معانی کی طرف ہم کو متوجہ نہیں کرتے؟ اور ہم کو ان معانی سے آشنا نہیں کرتے؟

۶

۱۔ معارج آیت ۴۰

قرآن مجید دودھ دینے والے جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ کہتا ہے وہ آج کے علم سے بالکلیہ موافق ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

حیوانات میں (یعنی) تمہارے گلوں میں درحقیقت تمہارے لئے ایک آموزش وسبق ہے۔ ہم حیوانات کے بدن کے اندر جو چیز پائی جاتی تھی اس سے اور خون وگوبر کے درمیان سے تمہارے پینے کے لئے خالص دودھ تم کو دیتے ہیں کہ جو لوگ دودھ پیتے ہیں ان کے لئے اس کا پینا آسان وگوارا ہے۔ (۱)

ڈاکٹر موریس بوکائی مغربی محقق اپنی کتاب میں تحریر کرتا ہے:

علمی نقطہ نظر سے اس آیت کو سمجھنے کے لئے وظائف الأعضاء کے دانش سے مدد حاصل کرنی چاہیئے۔

اصلی غذائی مواد جو بطور کلی بدن کی حفاظت کرتے ہیں یہ غذائی مواد نظام ہاضمہ میں شیمیائی تغیرات کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ مواد ان عناصر سے جو محتوای رودہ میں موجود ہیں حاصل ہوتے ہیں جس وقت یہ رودہ کے اندر کیمیائی تبدیلی کے مرحلہ میں پہنچتے ہیں تو رودہ کی دیوار سے جریان عمومی کی طرف گزرتے ہیں۔ یہ گذر دو طریقوں سے ہوتا ہے:

۱ ـــــ لنفاوی (۲) رگوں کے ذریعہ ڈائرکٹ

۲ ـــــ گردش کے ذریعہ ان ڈائرکیٹ

اس صورت میں پہلے مواد غذائی جگر میں جاتے ہیں اور وہاں کچھ تغیرات ہوتے ہیں اور پھر انجام کار وہاں سے باہر آکر جریان عمومی میں شامل ہوجاتے

۱۔ سورۂ نحل آیت ۱۲ ۲۔ ایک بے رنگ سیال شے جو بدن میں ہوتی ہے جس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سرخ ذرات کے بغیر مرکب خون

ہیں۔ اس طرح تمام غذائی مواد خون کے ذریعہ منتقل ہوتے ہیں دودھ بنانے والے عوامل چھاتیوں کے غدود کے ذریعہ نکلتے ہیں اور یہ غدود ان غذاؤں کے ہضم شدہ اجزاء کے اکٹھا کئے ہوئے اجزاء سے تغذیہ کرتے ہیں جو جریانِ خون کے واسطہ سے ان کے لئے لائے جاتے ہیں۔ پس خون تفتیش دریافت کنندہ اور غذاؤں سے استخراج کئے ہوئے مواد کو غدودِ پستانی ــ جو دودھ پیدا کرنے والے ہوتے ہیں ــ کے لئے غذا لانے کا کام دیتے ہیں اسی طرح دوسرے اعضاء کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔

یہاں پر تمام چیزیں یہ سطور دو یا روئی محتوای ردودہ و فوق سطح ردودہ میں عمل کرتے ہیں۔ اور یہ معلومات نظام ہضم کے شیمی اور فیزیالوجی سے حاصل ہوئی ہیں۔ اور یہ معلومات رسول خدا ص کے زمانہ میں مکمل طور سے مفقود تھے۔

اسی لئے میں سوچتا ہوں کہ قرآن کے اندر ایسی معلوماتی آیات کا وجود خود ہی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ یہ کسی فکر انسانی کا کام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ (۱)

۷

ابھی زیادہ مدت نہیں گزری جب جہانِ علم کے محقق حضرات نے یہ تحقیق فرمائی ہے کہ نباتات میں بھی تلقیح کا عمل پایا جاتا ہے اور یہ کہ ہر زندہ موجود نر و مادہ کے تلقیح سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

میکروسکوپ (۲) کی تحقیق سے پہلے اور ذرات تک انسان کی رسائی سے قبل کسی کو

---

(۱) توریت، انجیل، قرآن و علم ص ۲۶۸ (۲) ایسی خوردبین جن سے بہت باریک کیڑوں کو دیکھا جا سکے

نر و مادہ کے فعل و انفعالات کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا نہ زمانۂ جاہلیت میں اور نہ ہی کلاسیک علمِ گیاہ شناسی کے تدوین سے پہلے کوئی اسکو جانتا تھا۔

اس سلسلہ میں دانشمندوں کے فراوان تحقیقات و تجربیات نے یہ بات ثابت کی ہے کہ تلقیح سے پہلے تولید مثل ممکن ہی نہیں ہے۔ صرف بعض گیاہوں میں تقسیم سلولی کے واسطہ سے یہ کام انجام پاتا ہے۔

سب سے پہلے جس شخص نے واضح و روشن طریقہ سے اس علمی حقیقت کی تشریح کی ہے وہ دانشمند مشہور سویدی تھا جس کو شارل کہتے ہیں (۱۷۰۷، ۱۷۸۷)

ماہیتِ تولید مثل گیاہ علمی اطلاعات کے سہارے عموماً اساس تلقیح پر اور ذرات ذرہ بین کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور تلقیح کے منتقل ہونے کا ذریعہ حشرات الارض، مکھیاں، شہد کی مکھیاں وغیرہ ہوا کرتی ہیں اور بنیادی اور عمومی طور سے تلقیح کا ذریعہ ہوا اور آندھیاں ہوتی ہیں جو بے وزن ذرات کو ہوا میں منتشر کر دیتی ہیں۔

دنیائے نباتات کے اندر زوجیت کا مسئلہ اور علم گیاہ شناسی میں سلولہائے نر و مادہ کے وجود کو۔۔ جو ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھی اور بشر کیلئے ناشناختہ تھی۔۔ قرآن مجید کسی ابہام کے بغیر پوری وضاحت سے بیان کرتا ہے اور کمالِ فصاحت اعلان کرتا ہے:

کیا یہ لوگ زمین کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے گیاہوں کو اس میں جوڑا پیدا کیا ہے (۱)

دوسری جگہ اعلان ہوتا ہے:

ہم نے آسمان سے پانی اتارا اور اس کے وسیلہ سے مختلف نباتات کے قسموں میں جوڑے جوڑے پیدا کئے۔ (۲)

۱۔ سورہ شعراء آیت ۷ (۲) سورہ طٰہٰ آیت ۵۳

تیسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :

پاک و منزہ ہے وہ خدا جس نے تمام ممکنات کو جوڑا جوڑا پیدا کیا خواہ وہ نباتات ہوں یا نفوس بشر یا دوسری مخلوقات جن سے تم واقف بھی نہیں ہو ۔ (۱)

قرآن انسان، حیوان پھر نباتات میں زوجیت کو بیان کر کے اس کے دائرہ کو اتنا وسیع کرتا ہے کہ جس میں تمام اجزائے عالم ہستی آجاتا ہے اور دنیا میں جو چیز بھی موجود کہی جا سکتی ہے وہ اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

ہم نے ہر چیز کو جوڑا پیدا کیا ہو سکتا ہے تم خدا کو یاد کرو ۔ (۲)

۳

عصر حاضر میں انسان نے اپنی عمیق تحقیقات کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بغیر استثناء کائنات کے تمام مادوں کو اگر تحلیل نہائی دیجائے تو آخر میں ایک چھوٹی سی چیز پر خاتمہ ہوگا جس کو ایٹم کہا جاتا ہے ۔ اور یہ بہت ہی چھوٹا سا جزو بھی دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے ایک مثبت ایک منفی ۔

اگرچہ ماہیت کے لحاظ سے یہ دونوں جزو برابر ہیں اور یکساں ہیں لیکن ایک میں مثبت الکٹرک کی قوت ہے اور ایک میں منفی الکٹرک کی قوت ہے جو ایک دوسرے کو جذب کرتے ہیں ۔

قطب مخالف کی طرف میلان درحقیقت ہر ایک کے طبیعت میں چھپا ہوا ہے کہ اس جذب و انجذاب کے تحقق کے وقت ایک موجودیت سوی متحقق ہوتی ہے ۔ جو الکٹرک کے بار کے لحاظ سے خنثیٰ ہے ۔

جس ماحول میں قرآن نازل ہوا ہے ——— یعنی جہالت و نادانی کا ماحول

۱۔ سورۂ یٰسین آیت ۳۶ ۲۔ سورۂ ذاریات آیت ۴۹

___ اس ماحول میں ہر چیز کے جوڑا ہونے کی تعبیر بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ کیونکہ جن دو جسم کے درمیان دو قسم کے الکٹرک بار کی کشش موجود ہو وہاں بطور کلی زوجیت کے اطلاق کے لئے کچھ خصوصیات ضروری ہوتی ہیں اور یہ مکمل طور سے دو مختلف جنس کے درمیان کشش سے مشابہ ہے۔ اور اس زمانہ کے افق فکر کے لحاظ سے اس علمی واقعیت کا بیان ایک بہت ہی جالب اور رسا تعبیر ہے۔ جبکہ صورتحال یہ ہے کہ ابھی کچھ پہلے تک موضوع کے فیزیکی کیفیت سے کوئی شخص صریحی اور قطعی واقعیت نہیں رکھتا تھا۔

اس بنا پر ایٹم کے اندر بھی زوجیت کے ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مادی دنیا کی بنیاد زوجیت کے قانون پر ہے اور اس مادی کائنات کے اندر کوئی موجود اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

پال رابراک انگریزی محقق کہتا ہے، مادہ کے ہر جزء کے برابر ایک جزء ضد مادہ بھی ہے۔ ۱۹۵۵ میں اس کا تجربہ بھی ہو گیا اور علمائے فیزیک نے ایٹم شکن مشینوں کے ذریعہ ضد پروٹون اور ضد نوٹرون اور ضد مادہ کا انکشاف کر دیا اور ان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ضدِ مادہ کی دنیا بھی دنیائے مادہ کی طرح ہے۔ اور یہ دونوں ___ مادہ و ضد مادہ ___ ہمراہ بھی ہوا کرتے ہیں۔(۱) اور بیسویں صدی کا فیزیک داں ماکس پلانک کہتا ہے:

ہر مادی جسم الکٹرون اور پروٹون سے مرکب ہے۔(۲)

علوم طبیعی کا ایک عطیہ یہ بھی ہے جو تجربہ گاہوں کی تائید سے پایہ ثبوت تک

۱۔ مجلہ دانشمند سال ۹ شمارہ ۴ ۲۔ تصویر جہان در فیزیک جدید ص ۹۵

پہونچ چکا ہے اور وہ یہ ہے :

حجم زمین کی افزائش کا موضوع ریشۂ نباتات کے ذریعہ ہوا کرتا ہے ۔جب پانی جا بجا اُسے زمین کے اندر رخنہ پیدا کردیتا ہے تو جو ہوا وہاں پر اکٹھا ہوگئی ہے ۔ وہ اندر کی طرف چلی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمق زمین کی حالت میں اچھا خاصا جوش پیدا ہوجاتا ہے ۔

اور پھر جب بارش ہوتی ہے اور پانی زمین کے عمق میں نفوذ کرتا ہے تو نباتات کی جڑیں اپنی حرکت کا آغاز کردیتی ہیں اور مٹی کے اندر پیشرفت شروع کردیتی ہیں اور بدیہی طور سے سب ہی جانتے ہیں کہ پھر اصلی جڑوں سے ظریف تر اور نازک تر بہت سی جڑیں نکل آتی ہیں اور اطراف و جوانب میں پھیل جاتی ہیں ۔ مثلاً کسی بھی پودے کی جڑیں جو ایک سینٹی میٹر میں ہوں ہو سکتا ہے چار ہزار دو سو کی حدود تک پہونچ جائیں ۔

محققین کی نظر میں جڑیں اپنی ۹۵ فی صد ضروریات کو ہوا سے حاصل کرتی ہیں اور پانچ فی صد زمین سے حاصل کرتی ہیں ۔ اس بنا پر جڑیں جو زمین سے استفادہ کرتی ہیں وہ اپنے حجم میں چند گنا اضافہ کر لیتی ہیں ۔ اور اس ترتیب سے زمین گھاس اگنے سے کافی متورم اور پر حجم ہوجاتی ہے ۔

اب آئیے سورہ حج کی پانچویں آیت پڑھئے :

اور زمین کو دیکھو جب وہ خشک اور بے گیاہ تھی ۔ اس وقت ہم نے اس پر پانی برسایا تو وہ حرکت و جنبش میں آگئی اور پر حجم ہوگئی اور مختلف خوبصورت قسموں کی گھاس اگانے لگی ۔

دانشِ نو سے قرآن کے مطابقت کی یہ بھی ایک دلیل ہے ۔

۸

قرآن مجید نے ایک اور پدیدۂ طبعی کا ذکر کیا ہے۔ یعنی ہوا جو بار آور ہونے کی عامل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ہم نے ہواؤں کو بھیجا جو حاملہ کرنیوالی ہیں اور اس وقت آسمان سے پانی برسایا"[۱]

قرآن نے اوپر والی آیت میں آفرینش کے ایک بڑے راز سے پردہ اٹھایا ہے یعنی بادلوں کا حاملہ ہونا اور ہواؤں کا حاملہ کرنا۔

متمدن انسان نے الکٹریکل وسائل اور صنعتی آلات سے استفادہ کرتے ہوئے آخری سالوں میں ہواشناسی کے سلسلہ میں کافی پیشرفت کی ہے۔ اور متورولوژی یعنی محکمۂ موسمیات بنایا ہے۔

موسمیات کے ماہرین کا کہنا ہے:

یہ جان لینا چاہیئے کہ صرف دو چیزوں کا۔ ہوا میں بخارِ آب کا وجود ــــ اور شکم سیر ہونا ــــ فضا کی ہواؤں کا حالتِ اشباع میں پہونچ جانا ــــ بادل بنانے اور پانی برسنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ ایک تیسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ عمل لقاح ہے یعنی حاملہ کرنا۔

اسکی توضیح یہ ہے کہ پدیدہائے طبیعی کے ظہور میں ہمیشہ ایک قسم کی گڑبڑ اور تاخیر ہوا کرتی ہے۔ مثلاً اگر پانی خالص اور ٹھہرا ہوا ہے تو ممکن ہے کہ صفر کے درجہ سے نیچے چلا جائے اور منجمد نہ ہو اور

۱۔ سورۂ حجر آیت ۲۱۔

سو درجہ پر پہونچنے کے بعد بھی بہت دیر کے بعد جوش پیدا ہوا اسی طرح بخار آب کیلئے ممکن ہے کہ حالت اشباع میں پہونچنے کے بعد تقطیر نہ ہو اور جس وقت تقطیر ہو بھی جائے تو اسکے والے اتنے چھوٹے اور ہوا میں معلق ہو کے رہ جاتے ہوں کہ گرتے ہی نہ ہوں اور اس کی وجہ سے بارش نہ ہوپاتی ہو۔ لیکن اگر نمک کے چھوٹے اور نہ دکھائی دینے والے ذرے جو ہوا کے سہارے ذریاوں کے اوپر سے آجاتے ہیں ان سے نطفہ یائے جذب و آماس کنندہ کی تشکیل ہو جائے یا اس سے بہتر یہ ہو کہ ہوا کی رطوبت جو برگہ یائے متبلور برف کے اردگرد جمع ہو جائے جو ارتفاعات بالاتر میں منعقد ہوئی ہو اور ہوا کے ذریعہ منتشر ہو جائے تو تقطیر کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہواؤں کے تصادم و تلاطم و اختلاط کے زیر اثر بارش کے پہلے چھوٹے چھوٹے قطرے باہم مل جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ بڑے ہو کر اپنے وزن کے زیر اثر تودہ ہائے ابر کے درمیان سے گرنے لگتے ہیں۔

ہوا میں معلق اجسام اور عوارض زمین سے بادلوں کے مختلف ٹکڑوں کے ٹکرا جانے کے زیر اثر ایک چمک پیدا ہوتی ہے جو بجلی ہوتی ہے اور یہ بجلی شدید چمک اور زور دار کڑک کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے بھی بارش میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ایک گاز پیدا ہوتا ہے جس کو "اُزُن" کہتے ہیں اور یہ زیادتی باران میں مددگار ہوا کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ تشکیل ابر اور اسکی تقویت خصوصاً نزول باران یا برف باری عمل لقاح کے بغیر عملی نہیں ہو سکتی۔

مصنوعی بارش میں بھی تلقیح مصنوعی کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اسطرح کہ جب ہوا میں ابر بن جانے کی آمادگی ہوتی ہے لیکن وہ تاخیر تعادل کی حالت میں ہوتی ہے تو ہوائی جہاز کے ذریعہ غبار آب یا متبلور (وہ برف جو بلور کی مانند چمک رہی ہو) برف کے گرد این ہائیڈ رائیڈ کاربونیک (   ) چھڑک دیتے ہیں تو بارش

ہو جاتی ہے۔(۱)

ڈاکٹر موریس بوکائی جو مغربی دنیا کا جانا پہچانا مشہور دانشمند ہے وہ قرآن کے بارے میں کہتا ہے :

عہدین کے اندر عظیم علمی غلطیاں موجود ہیں ۔ لیکن قرآن میں مجھے کوئی علمی غلطی نہیں ملی اس چیز نے مجھ کو مجبور کیا کہ میں خود اپنے سے سوال کروں کہ اگر کسی انسان نے قرآن کی تصنیف کی ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی کتاب کے اندر ایسی چیزیں لکھی گئی ہیں جو آج کے دانش جدید سے موافق ہیں ؟

آخر اس حقیقت کے لئے کون سی بشری توجیہ کا قائل ہوا جا سکتا ہے ؟ میرے عقیدہ سے کوئی توجیہ ممکن نہیں ہے کیونکہ کوئی ایسی علت نہیں معلوم کی جا سکتی کہ شبہ جزیرۂ عرب کے باشندوں میں سے ایک شخص جس زمانہ میں فرانس کے اندر (داگوبر) بادشاہ حکومت کرتا تھا اتنی زیادہ علمی اطلاع رکھتا ہو کہ جو ہماری معلومات سے دس صدی آگے ہو۔(۲)

۱۔ ایچ ہائیڈرائیڈ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو پانی سے مرکب ہوتے وقت ایسیڈ (HC15) پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا گاز ہے جس کی بو تند اور مزہ ترش ہوتا ہے۔ آتش فشاں پہاڑوں کے پاس ہوتا ہے۔ قند وغیرہ بنانے میں کارآمد ہوتا ہے۔ ۲۔ توریت انجیل قرآن وعلم ص۱۴۲-۱۴۳

ایک عظیم حکومت کے شکست

کی پیشین گوئی

جس وقت مسلمان بہت کمزور تھے اور دنیا کی دو بڑی طاقتوں نے ــــ ایران وروم ــــ مشرق و مغرب کو تقسیم کر رکھا تھا۔ اس وقت شبہ جزیرہ عربستان کے سرحدوں کے قریب ان دونوں حکومتوں میں ایک شدید خونریز جنگ ہوتی ہے جس میں کامیابی ایران کے قدم چومتی ہے اور روم کی قسمت میں شکست لکھی جا چکی تھی۔

رومی حکومت خدا پرست اور ایرانی حکومت آتش پرست تھی جب رومیوں کو شکست ہو گئی تو مکہ کے بت پرست بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں کو اس سے بہت غم و اندوہ پہنچا کیونکہ اسی خونی جنگ میں بیت المقدس بھی ایران کے ہاتھ لگ گیا۔ مشرکین مکہ نے ایرانیوں کی فتح کو اپنے لئے فال نیک خیال کیا اور اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہم بھی مسلمانوں (خدا پرستوں) پر غالب ہوں گے

اس واقعہ سے مسلمان بہت دل تنگ ہو گئے اور آیندہ کے لئے اضطراب خاطر اور خوف دامن گیر ہونے لگا۔ اسی اثنا میں جبرئیل وحی لے کر آئے کہ دس سال کے اندر اندر خدا رومیوں کو ایرانیوں پر غالب کر دے گا۔ اور جنگ کا پانسہ رومیوں کے حق میں پلٹ جائیگا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

حجاز کی سرزمین کے نزدیک رومیوں کو شکست ہوئی لیکن یہ لوگ آئندہ اپنے دشمنوں

پر کامیاب و فتح یاب ہونگے ایک ایسی مدت میں جو دس سال سے کم ہوگی۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد تمام امور دست قدرت میں ہیں اور جس دن رومیوں کو اپنے دشمنوں پر کامیابی ہوگی مومنین اور اسلام کے پیروکاروں کو خوشی نصیب ہوگی۔ اور خدا جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے وہ قدرت والا اور مہربان ہے۔ یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا کا وعدہ کبھی تخلف پذیر نہیں ہوتا۔ لیکن بہت سے لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔(۱)

قرآن کی پیشین گوئی ۶۲۵ عیسوی مطابق دوسری ہجری میں صحیح ثابت ہوئی اور ابھی دس سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ ایران و روم میں دوبارہ سخت ترین جنگ ہوئی اور اس میں رومیوں نے ایران کی زمین پر قبضہ کر لیا۔

ب

ایک شکست خوردہ ملک کی فاتح ملک پر کامیابی کی پورے یقین کے ساتھ پیشین گوئی کرنا جس کے لئے قطعاً کوئی قرینہ بھی موجود نہیں تھا اس بات کی توجیہ کیوں کر کی جا سکتی ہے؟ رسول اسلام نے مستقبل میں جنگی کامیابی کی حتمی اطلاع کہاں سے حاصل کی؟ کیا عقل وانصاف کا تقاضا ہے کہ اس خبر کو سیاسی حضرات اور سیاسی مفسرین کی خبروں کی طرح مان لیا جائے؟

آیا کوئی ایسا معیار ہے کہ جس سے یہ پتہ لگایا جائے کہ مغلوب قوم جس کی جنگ کی وجہ سے روح نکل گئی ہو اور جس کا اعتماد ٹوٹ گیا ہو وہ ایک محدود اور مخصوص زمانہ میں فاتح قوم پر غالب آجائیگی اور اس کو کامیابی نصیب ہوگی؟

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ جنگی کامیابی میں بہت سے مسائل درپیش ہوتے ہیں اور معمولی سی ٹیکنیکی غلطی جنگ کے سرنوشت کو بدل دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ

۱۔ س روم آیت ۱

نہیں کہا جا سکتا ایک ایسی طاقت ہے جو اس قسم کے جنگی حادثہ کی بڑی یقین کے ساتھ مستقبل قریب میں خبر دے سکتی ہے؟ کیا اس قسم کے امور مادی طاقتوں کے بس کی بات ہے؟

دوسرے واقعات کی پیشین گوئیاں

قرآن مجید نے کچھ اور بھی پیشین گوئیاں کی ہیں جن کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ فتح مکہ اور مسلمانوں کا مشرکوں پر غلبہ، چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ کو خواب میں جس کا الہام فرمایا وہ سچ اور حقیقت ہے۔ بے شک نہایت آرام و اطمینان سے آپ مسجد الحرام میں داخل ہونگے اور اپنے سروں کو منڈوائیں گے اور اعمال تقصیر و احرام کو بغیر کسی خوف کے انجام دیں گے، جو باتیں آپ نہیں جانتے خدا ان کو جانتا ہے اور (فتح مکہ سے پہلے) دوسری کامیابی بھی حاصل کروگے جو نزدیک ہوگی۔ (۱)

اس آیت میں مسجد الحرام میں دخول، بغیر کسی ترس و ہراس کے اعمال عمرہ بجالانے کا اور مشرکین کی شکست کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یعنی پیشین گوئی کی گئی ہے اور اس کے مستقبل قریب میں مسلمانوں کی دوسری کامیابی کی بھی خوشخبری دی گئی ہے۔ حالانکہ مکہ میں مسلمانوں کا آنا اور آرام و سکون سے اعمال عمرہ بجالانا ان سخت حالات میں کسی بھی کارشناس اور فوجی مشیر کی نظر میں تحقق پذیر نہیں تھا کیونکہ پیروان اسلام کی حالت اس وقت بہت خراب تھی پس درحقیقت یہ ظاہری اقدام اور بدنی قدرت اور مجاہدین کی مسلح تیاری کی وجہ سے کامیابی نہیں تھی بلکہ یہ کامیابی خدا کی مدد جو مجاہدین کے شامل حال تھی اس کی وجہ سے تھی

۱۔ سورۂ فتح آیت ۲۷

قرآن کے تمام معجزات و فتوحات خدا کے حکم سے ہوتے ہیں مگر اس میں اس موضوع کا تکرار قدرت انتخاب و اختیار اور ابعاد وسیع کی حکایت کرتے ہیں۔

تاریخ کے اندر جو حقائق موجود تھے اور جو استعماری تغیرات تھے انکو ضروری تمام نقطہ و عوامل کے پیش نظر شکست و ریخت کرنے کے لئے انبیائے کرام تھے۔ ان حضرات نے فضائے معاشرہ پر چھائی ہوئی تاریکیوں کو جو خدا تک پہونچنے سے سد راہ تھیں اپنے پُر نفوذ نورانیت سے چاک کر دیا اور باذن خدا انسانوں کو رشد و ہدایت کی طرف لے گئے۔

اس تاریک دور میں تاریخ کی ضرورت تکاملی اس بات کی مقتضی تھی کہ بلند شخصیتوں کا ظہور ہو۔ اور ان حضرات کی آمد اساسی علل کی بنا پر ایک تاریخی ضرورت تھی جس کا ہونا ضروری تھا۔

تاریخی تحقیق و تجربہ بتاتے ہیں کہ انبیاء انسانی معاشرہ کو پست ترمرحلہ سے برتر معاشرہ کی طرف عبور کرانے کے لئے آئے تھے۔ اور دوسرے یہ خود انسان ہے جس کو بے وقفہ ظہور حوادث کی گردش کی شناخت کے پایہ پر اور اپنے مقاصد بلند کی طرف ہستی کی دائمی حرکت کے ستون پر مبدا آفرینش پر اعتقاد و ایمان رکھتے ہوئے تمام موجودات کی تسبیح کے ساتھ ہم آہنگی رکھتے ہوئے عمل شائستہ کر کے سمت خدا کے راستہ کو استوار رکھنا چاہیئے۔ اور اپنے فائدہ کی تلاش کرنی چاہیئے تاکہ پوری زندگی میں اس کا انسانی چہرہ خلیفۃ اللہ کے عنوان سے آشکار ہو۔

اس قسم کی زندگی بنا لینا اس کے لئے حرارت طبیعت و ہستی کے مقابلہ میں زندگی کی قدر و قیمت کا بیان کرنے والا ہے اور سرزمین کے اوپر ایک رشد یافتہ مفہوم حیات ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ درخشاں تیاغنے والے انسان انبیاء کے ربانی تعلیمات کے تحت تمام چیزوں سے ہاتھ دھو لیتے ہیں تاکہ اس چیز سے متصل ہو جائیں جو ہمہ چیز ہے اور ہر

چیز سے بلند ہے۔

۵

آیئے اصل موضوع کی طرف رجوع کریں۔ قرآن مجید نے ایک دوسرے تاریخی حادثہ اور اسلامی فوج کی کامیابی کا ذکر کیا ہے جس کو ہم "فتح خیبر" کے نام سے جانتے ہیں۔ کہ جب مسلمانوں پر ایک سخت دور آیا تھا۔ لیکن اس کا بھی انجام اسلامی فوج کی فتح پر اور یہودیوں کی شکست کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور قرآن کی پیشین گوئی حرف بہ حرف سچی ثابت ہوئی۔

کیا اس کامیابی کا سہرا وحی کے علاوہ کسی اور کے سر باندھا جا سکتا ہے؟ کیونکہ مسلمان تو اس وقت بہت ہی کمزور تھے اور کیا اس دقیق مستقبل بینی کو رسول خدا (ص) کے علم و دانائی سے نسبت دی جا سکتی ہے؟ نہیں! کیونکہ مستقبل کی حتمی خبر دینا اور غیر مشروط پیشین گوئی کرنا علم کا کام نہیں ہے بلکہ سچے انبیاء اور اولیائے خدا کا کام ہے۔

ان تمام جنگوں کی کامیابی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اسلام کفر کی تمام قوتوں پر مادی غلبہ پا گیا بلکہ تمام دشمنوں اور مخالفوں کو اپنے آئیڈیالوجی کے زیر اثر کر لیا۔

جب رسول اسلام مکہ میں مقیم تھے اور تبلیغاتی پروگرام محدود سطح پر بڑے سخت و جانفرسا حالات میں ادا کئے جاتے تھے اور مسلمانوں کا مستقبل مبہم و پیچیدہ تھا اس وقت قرآن نے ابولہب کا انجام بہ عنوان ایک روداد آئندہ بیان کر دیا تھا۔ اور مسلسل دشمنی اور رسول اسلام سے عناد کی خبر بھی دم تک کے لئے دیدی تھی اور یہ بھی کہدیا تھا کہ اسی دشمنی کی وجہ سے ہمیشہ آتش دوزخ میں رہے گا۔

اگرچہ آغاز اسلام میں بہت سے آنحضرت (ص) کے وابستگان بھی مخالف صف میں تھے لیکن اپنی تمام سختیوں اور کج اندیشیوں کے باوجود جہل و عناد کے تاریک پردوں سے حق پذیری کا سورج چمک ہی اٹھا۔ اور وہ لوگ اپنے روش و عقیدہ کو بدل کر مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس بحرانی اور تپ آلود دور میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون حضرات حق قبول کریں

گے اور اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے جنت میں جائیں گے اور کون لوگ مرتے دم تک اسلام کی مخالفت کرتے رہیں گے کیونکہ زمان وحوادث وشرائط طبیعی کے گزر جانے کے بعد انسان کے لئے نئے حالات پیدا کردیتے ہیں اور لوگ اپنے موقف کو بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لہٰذا کسی بھی فرد کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا اس کا انجام کیا ہوگا؟

لیکن اس کے باوجود قرآن ایک مخصوص شخص کی زندگی کے انجام کو قطعی طور سے اعلان کرتا ہے کہ یہ شخص مرتے دم تک اسلام قبول نہ کرے گا اور اسی وجہ سے وہ دوزخ میں قہرِ الٰہی کا شکار ہوگا اور وہ شخص ابو لہب ہے۔(۱)

یہ آیاتِ قرآنی کا ترجمہ سنئے:

ابو لہب نابود ہو جائے اور اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں (اسلام کے مٹانے کیلئے) جو مال و ثروت اس نے جمع کیا تھا اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا اور نہ وہ اس کو ہلاکت سے بچا سکا۔ بہت جلد وہ دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (۲)

تاریخ لکھنے والے جب ابو لہب کی حالات لکھتے ہیں تو اس بات پر سب ہی متفق نظر آتے ہیں کہ وہ بے ایمان دنیا سے گیا اور عمر کے آخری لمحہ تک رسول خدا سے دشمنی پر آمادہ رہا اس واقعہ کے سلسلے میں جو آیات نازل ہوئیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب مقدس کی جہت بہ سمت خدا معطوف ہے اور جہانِ ماورائے طبیعت سے اس کا ایک گہرا اور عمیق رشتہ ہے۔

دوسری آیتوں میں بھی قرآن نے آئندہ ہونے والے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً رسول خدا ص کی پورے دورِ تبلیغ رسالت میں حفاظت اور دشمنوں کے شر سے قطعی طور پر

۱۔ قرآن میں تبت یدا کا سورہ جس ابو لہب کے لئے کہا جاتا ہے وہ رسول خدا کا چچا نہیں تھا۔ تفصیل کے لئے کتاب ابو لہب چھاپ پاکستان پڑھیئے۔ مترجم

۲۔ سورہ لہب آیات ۱ تا ۳

آپکی معصومیت کا تذکرہ کیا ہے ۔ حالانکہ بعثت کے تیسرے سال کوئی بھی ایسا قرینہ موجود نہیں تھا جس سے یہ پتہ چلتا کہ آپ پورے دورِ تبلیغ میں دشمنوں کے شر سے محفوظ رہیں گے ۔ لیکن زمانہ نے بہرحال اس پیشین گوئی کو ثابت کردیا (۱)

سورہ کوثر میں بھی قرآن لوگوں کو مطلع کرتا ہے کہ رسولؐ کی اولاد مستقبل میں روز افزوں ہوگی ۔ حالانکہ رسولؐ خدا کی زندگی میں دشمنانِ رسولؐ نسلِ رسولؐ کے منقطع ہوجانے کی امید میں بیٹھے تھے ۔ کیونکہ آنحضرتؐ کی زندگی میں آپؐ کے دو لڑکے اللہ کو پیارے ہوگئے تھے ۔ لے دے کے صرف ایک لڑکی جناب فاطمہؑ موجود تھیں ۔

ان حالات میں بھلا خدا کے علاوہ کس کے لئے ممکن تھا کہ وضعِ موجود کے برخلاف پیشین گوئی کرسکے ؟ ۔

جب مشرکینِ مکہ کے سخت فشار و دباؤ کی وجہ سے آنحضرتؐ مکہ کو چھوڑنے اور مدینہ آباد کرنے پر آمادہ ہوگئے اس وقت دوبارہ وطن واپس آنے کی پیشین گوئی کرنا صرف خدا ہی کا کام تھا ۔ قرآن کہتا ہے :

جس خدا نے قرآن کی تلاوت تم پر واجب کی ہے وہی تم کو تمہارے وطن واپس کرے گا (۲)

اسی طرح مسلمانوں کے ہاتھ سے مکہ کا فتح ہونا اور وسیع پیمانہ پر لوگوں کا اسلام کی طرف راغب ہونا اور دستہ دستہ کرکے لوگوں کا مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہونا ان تمام باتوں کو سورۂ نصر میں ذکر کرتا ہے ۔ یہ تمام غیبی باتیں منبعِ وحی کے علاوہ اور دانش لا متناہی خدا سے ارتباط اور ماورائی طاقت کے علاوہ توجیہ پذیر نہیں ہیں ۔

---

۱ ۔ سورۂ حجر آیت ۹۴ ، ۹۵   ۲ ۔ سورۂ قصص آیت ۸۵

یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ ان تمام جنگوں میں مسلمانوں نے قرآن کی رہنمائی میں نہایت ہی جوانمردی اور شجاعت کا مظاہرہ کیا ۔ اور چونکہ اسلامی جنگیں سب کی سب توحید، عدل، انصاف کے قیام کے لئے تھیں اس لئے جنگ مغلوبہ اور تلواروں کی جھنکاروں میں بھی مسلمانوں نے جنگ کی اصلی وجہ کو فراموش نہیں کیا ۔

باوجود اس کے کہ جنگی کامیابی مشرکین سے ان کے کرتوتوں کا گن گن کر بدلہ لینے کا بہترین موقع تھا، لیکن مسلمانوں نے اس حالت میں بھی اپنے نفسوں پر کنٹرول رکھا تاکہ جنگ کا مقدس مقصد شخصی اغراض و مقاصد کے اندر چھپ کر نہ رہ جائے ۔

مباحث قرآنی میں یگانگت

کوئی بھی انسان ہو یا محقق وہ اپنے علمی تحقیقات میں اپنی رائے بدلتا رہتا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے معلومات اور اندوختہ ہائے فکری میں ایک مسئلہ کے اندر مخصوص رائے رکھتا ہو۔ لیکن مسلسل تحقیقات اور وسیع مطالعہ کی بنا پر اور مسئلہ کی گتھیوں کے سلجھ جانے پر اپنی پہلی رائے بدل دے۔ اور نئی تحقیق اس پہلی مخصوص رائے کی جگہ لے لے۔ انسانی نظریات میں اختلاف وتناقض کا یہ بہت بڑا سبب ہوا کرتا ہے۔ آثار ونوشتہ جات وآراء کے اندر تجدید نظر اور اشتباہات کی اصلاح دانشمندوں، قانون بنانے والوں، اور لکھنے والوں کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے۔

اسی طرح بڑے بڑے حادثات اور مختلف تجربات کی بنا پر بھی مسائل کے بارے میں انسان کا نظریہ بدل جاتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی مضبوط ارادہ وفکر متعادل کا مالک وآزاد منش رہا ہو۔ زندگی کے نشیب وفراز، دگرگونی حیات کے طوفانی حادثات خواہ مخواہ انسان کے ارادہ وثبات فکر کو بدل دیتے ہیں اور وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جب انسان ضعیف وناتوان ہوتا ہے تو جہان بینی کے سلسلہ میں ایک نظریہ رکھتا ہے لیکن یہی انسان جب مسند قدرت پر تکیہ لگاتا ہے تو جہان بینی کے سلسلہ میں نظریہ بدل جاتا ہے۔ پہلے کے مخصوص مسائل میں اپنی نئی رائے قائم کرتا ہے

ہے۔

اور قرآن نے بھی اپنے آسمانی ہونے کے ثبوت میں اس دلیل کو پیش کیا ہے کہ تئیس سال کی مدت میں نازل ہونے والا قرآن تناقض سے بالکل پاک و صاف ہے۔ چنانچہ قرآن بطور چیلنج اعلان کرتا ہے:

کیا وہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے کہ اگر یہ قرآن غیر خدا کے پاس سے آیا ہوتا تو یقینی طور سے اس میں بہت اختلاف پایا جاتا۔ (۱)

اس آیت میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ مسیر حقیقت و راستی سے منحرف افراد فطری طور سے اپنے گفتار میں تناقض گوئی کے شکار ہوتے ہیں اور یہ کہ قرآن کے اندر معمولی سا بھی اختلاف نہ مطالب کے اندر پایا جاتا ہے اور نہ ہی اسلوب بیان میں کوئی پراکندگی موجود ہے۔ اسی لئے قرآن نے اس حقیقت کو فطرت انسانی کے حوالہ کر دیا ہے۔ تاکہ ہر قسم کے ذہنی تعصب سے دور افراد حقیقت کے چہرہ کو دیکھ سکیں اور حق و باطل میں فرق پیدا کر سکیں۔

جب ہم تاریخ میں پیغمبر اسلام کے حالات پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں بہت زیادہ فراز کو پیچھے چھوڑا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب آپ ایک محروم و تہی دست اقلیت کے نمائندہ تھے اور پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ مادی امکانات۔ ثروت و مالداری آپ کے قدم چوم رہی تھی۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ کمزوری، تنہائی، فشار، معاشرہ کی طرف سے محاصرہ اتنا زیادہ تھا کہ دوسرا آدمی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ آپ عزت و شہرت

۱۔ سورہ نساء آیت ۸۱

اور اس وقت اس کے بدلے ہوئے نظریات وافکار کو اس کی گفتگو اور اس کے عمل سے پہچانا جا سکتا ہے۔ انسان کے طرز فکر کے بدلنے اور نظریہ میں اختلاف و تناقض کا یہ دوسرا بڑا سبب ہے۔

اس کے علاوہ ذہین عقلمند افراد بخوبی اس بات کو جانتے ہیں کہ راہ راست سے منحرف افراد چاہے جتنا با ہوش وحساب گر ہوں وہ ناد انستہ طور پر تناقض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کسی معاشرہ میں سالوں زندگی گذاریں اور مختلف مسائل میں اظہار نظر بھی کریں تب تو تناقض بہت ہی واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ صرف خط حقیقت وسچائی سے انحراف کی وجہ سے براہ راست نتیجہ نکلتا ہے۔

قرآن مجید نے مختلف موضوعات میں عمیق و دقیق مسائل کو پیش کیا ہے اور عملی وظائف، اجتماعی نظام، حکمرانی، اخلاقی اقدار، اور احکام کے لئے کچھ اصول وقوانین بنائے ہیں۔ لیکن ان مسائل کے انبوہ میں معمولی تناقض یا اختلاف ہرگز ہرگز نہیں پایا جاتا۔ اور اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ قرآن پورے تیئس سال میں تدریجی طور سے نازل ہوا ہے پھر بھی آیات کی ہم آہنگی وتناسب میں کوئی ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا ہے یہ اس کا معجزہ ہے۔

یہاں پر دو پہلوؤں سے قرآن کی قدر وقیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:۔

(۱) ــــــ ایک تو آیات کا انفرادی کیفیت کے ساتھ ہر ایک کا دوسرے سے جدا ہونا بے مثال درخشندگی کے ساتھ واضح ہے

(۲) ــــــ دوسرے از لحاظ تناسب وہم آہنگی اور اسلوب ومضامین میں عدم تناقض پورے قرآن میں مجموعی طور سے موجود ہے یہ گویا دوسرا اعجازی طریقہ

کی ایسی کرسی پر بیٹھے کہ اس زمانہ کے طاقتور اور عظیم ملت کے رہنما شمار کئے جانے لگے ۔ مختصر یہ کہ کبھی تو جنگی بحران اور قلت ساز و سامان سے دوچار تھے اور کبھی صلح و آشتی کی زندگی بسر کرتے تھے ۔

انسانی زندگی اپنی وسیع عملداری میں اقسام تفکر اور پیوند انسان با انسان اور پیوند انسان بہ طبیعت کی شکار رہتی ہے اور یہ عوامل و حادثات انسان کی زندگی پر اس طرح حکومت کرتے ہیں کہ اس کے اندر بنیادی تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں اور اندرونی و بیرونی ارتباط کی وجہ سے اس کا موقف دگرگوں ہو جاتا ہے اور زندگی کے ہر مرحلہ میں ایک نظریہ ۔ ایک شبکہ بندی مخصوص روابط کی بنا پر موجود ہو جاتا ہے

ان حادثات سے دوچار ہونا کسی ایک صورت میں مخصوص نہیں ہے ۔ بلکہ انسان کبھی تو ان حادثات کو اپنے رشد و ارتقا کا وسیلہ بنا لیتا ہے اور اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کر لیتا ہے ۔ اور کبھی ان کے ذریعہ اپنے آئیڈیل چہرہ کو متغیر کر لیتا ہے ۔ یہ صرف انسان ہی ہے کہ خارجی حادثات کے مقابلہ میں اپنی ایک مخصوص جگہ بنا لیتا ہے ۔
مختصر یوں سمجھ لیجیے کہ یہ دنیاوی زندگی اپنے وسیع ابعاد اور مختلف تظاہرات کی وجہ سے انسانی قدر و قیمت کو معین کرنے والی ہے ۔

۵

گوناگوں حالات اور متفاوت شرائط کے ساتھ ۲۳ سال کے اندر تدریجی طور پر مکہ اور مدینہ میں نازل ہونے والا قرآن اگر محمدؐ کے افکار و نظریات کا مجموعہ ہوتا تو قہری اور جبری طور پر تکامل کے ناپذیر قانون استثنا پر مشتمل ہوتا اور اس کے اندر وحدت کا فقدان ہوتا ۔ اور اسور جہاں بینی میں واضح اختلافات کا شکار ہوتا اور تضاد و تناقض سے محفوظ نہ ہوتا اور اسلوب و بلاغت میں ہم آہنگی نہ ہوتی ۔
جو کتابیں حقوق (قانون) ، تاریخ ، فلسفہ ، اجتماع ، ادب وغیرہ کے موضوعات

پر لکھی جاتی ہیں اور وہ تنہا کسی ایک ہی موضوع کے بارے میں شرح و تحقیق پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کے برخلاف قرآن مکمل مختلف مسائل اور گوناگوں موضوعات پر مثلاً قانون و سیاست معارفِ الٰہی۔ قوانینِ مدنی و جزائی، اخلاق و آداب، تاریخ، فروعی احکام جیسے دسیوں دیگر موضوعات پر گفتگو کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود استحکامِ مطالب و کیفیتِ اسلوب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور رسول اکرمؐ پر سب سے پہلے نازل ہونے والے سورہ (اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ) اور سب سے آخر میں نازل ہونے والے سورہ (النصر) میں تھوڑا سا بھی اختلاف موجود نہیں ہے پورے قرآن میں گیرائی، بلاغت، بہترین تعبیر بارانِ قسا طع کی طرح درخشندہ ہے۔

قرآن ایک منسجم اور ہم آہنگ کتاب ہے اس کا کوئی قانون دیگر قوانین و اصول سے ماخوذ نہیں ہے۔ ایک اصل کے بارے میں بحث دیگر اصول کے گشائش کی چابی ہو سکتی ہے۔ قرآن کی کامل ہم آہنگی، فلسفی و اخلاقی مبانی، احکام فردی و اجتماعی، عبادی قوانین، تربیتی نظام، اصول جہانداری، معنوی مقاصد یہ سب چیزیں قرآن کے اعجاز کی اساسی ماہیت کو روشن کرنیوالی ہیں ــــــ قرآن کے کسی اصول و احکام میں موازینِ اعتقادی، مبانی فلسفی و تربیتی و اخلاقی سے کسی بھی قسم کا اختلاف ہم کو نظر نہیں آتا۔ اور اس کی اس وسعت کے باوجود کسی حکم میں مختلف اصول سے کوئی ٹکراؤ نہیں ملتا۔ بنابرایں قرآن کے استثنائی خصوصیات اور اس کا بے چون و چرا تفوق اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ مجموعہ رقابت ناپذیر، وجودِ حقیقت پائیدار خداوندی سے منشاء حاصل کئے ہے کہ جس کی ذات لامتناہی میں کسی بھی قسم کا تغیر و تضاد نہیں ہے۔

قرآن کی ختم نہ ہونے والی

خصوصیّت

قرآن تاریخ بشر کے حیرت انگیز تحولات کی کتاب ہے جو اپنے حیاتِ جاوید کے ساتھ زندہ سند اور مضبوط دلیل کے ساتھ ہمیشہ درخشاں رہی ہے اور تشریع کی ژرف نگاہی اور انسان کی فطری ضرورتوں کی ذمہ داری کے لحاظ سے سرشار و مالامال تریق منبع ہے جو بشریت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ فطری اساس پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے اور مخصوص واقع بینی کے ساتھ انسان کو اس نے موردِ تحلیل قرار دیا ہے اور انسان کی تمام زندگی میں اس کے نقشِ تعیین کنندہ کی ذمہ داری لی ہے۔ اور یہی چیز اسلام کے جاودانی ہونے کا سبب ہے۔

کائنات کے اندر وسیع علمی تحولات کے پیشِ نظر بنیادی اور اساسی تغیّرات ہوئے ہیں اور اسلام کے مبانی کو ان تمام عالمی افکار کے مقابلہ میں دقتِ نظر کے ساتھ پیش کرنے سے وجہ تمایز کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگر اسلامی اصول و مقررات دیگر مکتبہائے فکر کے ردیف میں ہوتے تو سطحِ دانش کی ترقی کے ساتھ بطورِ کلّی اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے۔ حالانکہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج علمی و قانونی مجامع میں اسلام کی موقعیت مزید مستحکم ہو گئی ہے۔

تمام آثار و کتب و نوشتہ جات میں محدود الفاظ کے قالب میں محدود معانی ہوا کرتے

ہیں ۔ لیکن قرآن نے محدود الفاظ کے قالب میں غیر متناہی معانی بیان کئے ہیں جو پروردگار کے لامتناہی علم سے ناشی ہے اور قرآن کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے جو اس کو تمام کتابوں سے ممتاز کردیتی ہے ـــــ قرآن کائنات طبیعت کا گویا دوسرا نسخہ ہے کہ جس طرح گذشت زمان ، دانشوں کی وسعت اور پوشیدہ خزانوں کو فطرت آشکار کرتی ہے اسی طرح ظہورِ مفاہیم ، عمیق ذہانہ معانی ہمیشہ قرآن میں آشکار ہوتے ہیں ۔

اگرچہ خداوند کتاب نے اپنے کو انسانوں کے تعقل کی خاطر گویا اور قابلِ درک قرار دیا ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ انسان کی علمی ظرفیت ، نظریات ، عقول زیادہ وعمیق ہوتے جائیں گے اور نظامِ ہستی اور اس کے علمی اصول میں تحقیقات ومطالعات بیشتر ہونگے اور اسی طرح نفسانی وروحانی کاوشیں جتنی زیادہ عمیق ہوتی جائیں گی اور وسیع تجربات نظام وقانونِ اجتماعی اور اصول روابط حقوقی جتنے روشن ہوتے جائیں گے ۔ اتنا ہی ملا متوجہ کے ساتھ اسرار ورموزِ آیاتِ قرآن وشعاعِ وحی الہیٰ آشکارا ہوتے جائیں گے اسی لئے جن مفکرین نے صدیوں اور بین الملی حقوق کے شناخت میں اپنی پوری عمریں گنوادی ہیں وہ بھی قرآن کی بلند چوٹی تک نہیں پہونچ سکے ۔ بقول مولائے متقیان حضرت علیؑ قرآن ایک ایسی فروزان مشعل ہے جس کا فروغ کبھی خاموش نہیں ہوگا اور ایسا گہرا دریا ہے کہ فکر بشر اس کی گہرائی تک پہونچ نہیں سکتی ۔ (۱)

ابتدائے طلوعِ اسلام سے آج تک بہت سی علمی وایمانی شخصیتوں نے قرآن کی متنوع آیات کے فہم وادراک کے لئے اپنے بلند پرواز افکار کو استعمال کیا اور ہر زمانہ میں سیکڑوں ماہرین (ایکسپرٹ) اشخاص نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق آیات اور اس کے مفاہیم کے بارے میں کام کیا اور معارفِ قرآنی کے

۱ــ اصول کافی ص ۵۹۱

زیادتی کے ساتھ اور سطح بینش وآگاہی کے بلند ہونے کی وجہ سے خود اپنے آثار میں تجدید نظر کرتا ہے اور بڑی گہرائی سے اس کی نارسائی کی جبران کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے ۔ اور اس قسم کی ترمیم وتکمیل کے لئے ہمیشہ میدان کھلا ہے ۔ اس کے علاوہ ہر انسانی دقیق وقیمتی کارنامہ تحقیق ومطالعہ کے لئے محدود استعداد اور ختم ہو جانے والا ہوتا ہے اور اس کا قیمتی سسٹم کچھ اس طرح کا ہے کہ چند کارشناس واکسپرٹ حضرات اس کی تحقیق اور تمام گوشوں کو واضح کرنے پر قادر ہیں لیکن قرآن کریم جو مرکز وحی اور دانش آفریدگاری سے سرچشمہ حاصل کئے ہے اس لئے تمام انسانی خرد وادراک اور افکار اس کے غیر متناہی منبع علم وحکمت کے مقابلہ میں ایک ناچیز قطرہ اور اس حقیقت کے بصیرت ودانائی کے خیرہ کنندہ فروغ کا ایک کم رنگ شعلہ ہیں ۔ اس لحاظ سے قرآن تحقیق وکشف واستنباط کی ایسی صلاحیت رکھتا ہے جو ختم ہونے والی نہیں ہے ۔

اور یہ موضوع صرف فقہی وحقوقی مسائل میں منحصر نہیں ہیں بلکہ محققین ۔ معارف انسانی کے ہر رشتہ کے بُعد کو کشف کر سکتے ہیں ۔ بلکہ جدید علوم انسانی کے ماہرین روانشناسی اور فلسفہ تاریخ ، اور جامعہ شناسی کے ایکسپرٹ ایسے دقیق علمی اور نئے نکتے نکالتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن دارائے ظرفیتہائے متنوع اور گوناگوں ہے جو افکار ایک فرہنگ وایک زمانہ کے تصویر میں نہیں سما سکتے ۔ اور اب تک (قرآن کے علاوہ) کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی گئی جو اس وسیع کائنات میں چودہ سو سال سے اصول وموازین کلی وجزئی کے اعتبار سے اس قدر کارآمد ہوئی ہو اور عجیب ترین بات یہ ہے کہ تحقیق واجتہاد کے نظر سے اس کی استعداد ختم ہونے والی نہیں ہے ۔ یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ تحقیق وتفکر کے طفیل میں جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے ۔ وہ ابتکار ومہارت

افق تک پہونچنے کے راستے کھولے بلکہ غیر مسلموں نے بھی اس سلسلہ میں بڑی دقتِ نظر کے ساتھ تحقیقات کی ہیں۔ جن کے نتائج نے فرہنگ اسلامی کی وسعت میں موثر حصہ لیا۔ اور یہ صرف قرآن کا امتیاز ہے کہ اس نے اپنے پر قیمت نظام کو شائستہ میراث کے عنوان سے دنیا والوں کے لئے بطور یادگار چھوڑا۔

متمدن و ترقی یافتہ دنیا کے وضعِ قانون کے سسٹموں کو اگر دیکھا جائے تو قرآن کی بے مثال جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اس قرآن کے درمیان جو انسانوں کو عروج کی تربیت دینے کے لئے نازل کیا گیا تھا اور دوسرے واضعین قانون کے درمیان ہم کو عظیم تفاوت کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ ان ملکوں میں سعادت آفرین قوانین کی وضع ایسی فضا میں ہوئی ہے جو مکمل طرح سے ذہنی و خیالی تھی۔ اور اس وضعِ قوانین کے سلسلہ میں اسی رشتہ کے دانشمندوں کے افکار سے اس امید پر استفادہ کیا گیا تھا کہ یہ راستہ انسان کی تمام مادی و معنوی ضرورتوں کو پورا کریگا لیکن صرف عینی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور بنیادی حقیقتوں سے اس حد تک غفلت کرتے ہوئے کہ کبھی خود اپنی خواہشات کے مطابق قانون وضع کر دیئے جاتے تھے اور نظامِ فطرت اور انسان کے باطن میں جو طریقے حاکم تھے ان سے چشم پوشی کر لی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بظاہر سالم و صحیح قوانین تجربات کے بعد اپنی کوتاہی اور ناپسندیدہ نتائج کو ظاہر کر دیا کرتے تھے جس کی بنا پر ان کی اصلاح اور تجدیدِ نظر حتمی و ناگزیر ہو جایا کرتی تھی۔

دنیا میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے فنی ابتکارات اور علمی تحقیقی آثار ہر عصر میں سب سے برتر ہیں۔ کیونکہ ضرورت تکامل اس بات کو واجب بناتی ہے کہ زمانہ کے ساتھ علمی و تحقیقی سلسلہ بھی نئے سانچہ میں ڈھل جائیں اور فکری و عملی آثار بنیادی طور سے تحول پذیر ہو جائیں بلکہ ہر دانشمند علمی مراتب کی

وقدرت جوش کے ساتھ وہ شیوہ بائے بدیع تحقیق سے وابستگی رکھتا ہے لہٰذا آیات کے مفاہیم و معانی کے سلسلہ میں اپنے شخصی استنباط ہی پر محدود نہیں رہنا چاہیئے۔
وہ مخصوص مسائل جو خدا، قیامت، اخلاق، فقہ، حقوق (قانون) سے مربوط ہیں اور وہ تاریخی قصے جو قرآن میں ذکر کئے گئے ہیں ان کا ایک دقیق مطالعہ اور وہ وسیع مقاصد جو خشک و بے ثمر ظواہر سے متعلق ہیں ان کا اگر اس حیثیت گوناگوں سے مطالعہ کیا جائے جو اس طولانی مدت میں ظاہر ہوئے ہیں اور جنھوں نے انسان کو تلاش فکر اور بلند مراحل میں قدم رکھنے پر آمادہ کیا ہے اور اسی کے ساتھ قرآن کی شگفت انگیز تعلیمات کو دیکھا جائے اور ان تحقیقاتی مراحل میں کہ جو تازہ بتازہ حقائق وجود میں آتے ہیں ان کی شناخت و ادراک کو پیش نظر رکھا جائے تو قرآن کی بے مثال ثروت مندی اور گہرائی کا ثبوت ملتا ہے۔
قرآن کی عظیم معنوی ثروت، علمی و فرہنگی وسعت کچھ اس قسم کی ہے کہ محققین و دانشمندوں کی تحقیقات کی بنیاد پر اگر قرآن سے مربوط تالیفات و آثار اور تمام تفاسیر جامع و موضوعی یا وہ تفاسیر جو آیاتِ احکام سے متعلق ہیں یا قرآن کے معین سوروں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے ان سب کے ارقام و اعداد کو دیکھا جائے تو بے تردید ان کی تعداد دسیوں ہزار تک پہونچ جائے گی۔ پس کیا یہ جامعیتِ استثنائی ایک تاریک دور کے پسماندہ ترین علاقہ (یعنی جزیرۃ العرب) کے ایک درس نا خواندہ انسان کے افکار کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا ممکن ہے کہ آج کے دور میں کوئی شخص اسلام کی طرح کا نظامِ قانون گزاری جو تمام شعبۂ حیات کا جامع اور دقیق ہو پیش کر سکتا ہے جو صرف ایک ذہنی شکل میں باقی نہ رہے بلکہ اس کا دائرۂ کار خود سازی سے معاشرہ سازی تک پھیلا ہو اور وہ ایک بلند انسان اور پاک و پاکیزہ معاشرہ عطا کر سکے؟
قرآن کے اعجاز کی بات ظنی و خیالی نہیں ہے اور نہ کوئی افسانہ ہے بلکہ یہ ایک

علمی، عقلی، منطقی معیار کی گفتگو ہے۔ یہ ایک ایسی ملموس حقیقت کے بارے میں بحث ہے کہ ہر وہ انسانِ عاقل جو مقدماتی اطلاعات رکھتا ہو وہ بخوبی اس بات کا احساس کر سکتا ہے کہ یہ بشری طاقت سے بالاتر قوت سے مرتبط ہے۔ پس کیا قرآن کے یہ خصوصیات اور انحصاری امتیاز کہ جس نے اپنی علمی قدر و قیمت اور اہمیت کو زمانۂ مابعد کے لئے پہلے ہی کی طرح سے محفوظ رکھا ہوا ایک عادی اور فطری باتیں ہیں؟ یا یہ ایک سند اور روشن دلیل ہے اس بات پر کہ اس کی یہ مزیت اور غیر متناہی صفت ایسے آفریدگار سے منسوب ہے جس کا وجود لا متناہی ہے۔

بارتھی ہیلر فرانسیسی مشرق شناس محقق اپنی کتاب میں جامعیت قرآن کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

ہم جس طرح مجبوراً قرآن کے جمالِ فصاحت کا ادراک اس کے ترجمہ میں کرتے ہیں اسی طرح مزامیر داؤد اور اوداما کے نغموں کی خوبصورتی کو ان کے ترجمہ سے محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہودیوں کے لئے مزامیرِ داؤد میں مدنی قوانین اسی طرح مفقود ہیں جس طرح ہندوؤں کے لئے وید کے نغموں میں مفقود ہیں یہ استثنائی خصوصیت صرف قرآن کو حاصل ہے کہ اس میں متنوع مباحث اور گوناگوں امتیازات موجود ہیں۔ قرآن مذہبی نغمہ بھی ہے ستائشِ الہٰی بھی ہے، مدنی قانون بھی ہے، دعا و مناجات بھی ہے، وعظ و ارشاد بھی ہے، راہ و رسم جنگ آوری بھی، مناظرات کا مجموعہ بھی ہے قصص و تاریخ کا ذخیرہ بھی ہے۔ (قرآن و محمد)

سنہ ۱۹۵۱ء میں پیرس کے دانشکدۂ حقوق نے تحقیقِ فقہ اسلامی کا ہفتہ منایا جس میں چند موضوعات کے بارے میں فقہِ اسلامی کے نظریہ کو موردِ بحث و تحقیق بنایا گیا اور جب فقہ اسلامی کا مخصوص ہفتہ ختم ہوگیا تو جلسہ نے یہ تصویب نامہ صادر کیا۔

"بغیر کسی شک کے فقہ اسلامی میں اتنی صلاحیت ہے کہ اس کو دنیا کے منابع

قانون گزاری میں سے ایک قرار دیا جائے۔ فقہ اسلامی کے مختلف مذاہب کے آراء و اقوال میں فراوان سرمایۂ حقوق موجود ہیں جو ہر طرح باعث تعجب ہیں۔ اسلامی فقہ ان اقوال و آراء کے پیش نظر زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

قرآن کی گیرائی اور اس کا دائمی نفوذ

قرآن کے خصوصی استشناسائی کے لئے ایک اور دریچہ ہے اور وہ اس کا حیرت انگیز جذابیت و دوام ہے۔ بہترین علمی آثار ہوں یا ادبی و شعری شاہکار آپ اس سے چاہے جتنا زیادہ علاقہ رکھتے ہوں اس کو چند بار پڑھنے کے بعد آپ کو احساس خستگی و ملال ہونے لگے گا۔ کیونکہ جاذب ترین نوشتہ جات اور آثار جو آج کے یا کل کے نوابغ دہر کے شاہکار ہوں چونکہ وہ نقطۂ ثابت و دائم نہیں ہیں جو جاودانگی سے بہرہ بردار ہوں بلکہ وہ ایک مدت تک پڑھنے والے کے افکار کو متاثر کر سکتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ کشش اور جذبہ کم ہوتا جائے گا۔ اور آخر میں یہ عالم ہوگا کہ وہ آپ کی توجہ کو بھی اپنی طرف منعطف نہیں کر سکے گا۔

۞

لیکن یہ مخلوق نسخہ جس کو قرآن کہا جاتا ہے اگر اس کی تحقیق کریں تو جو ہر تعلیمات خدائی کے قرآن آشنا لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ تلاوت قرآن کا جذبہ کبھی کم نہیں ہوتا۔ آپ سیکڑوں بار قرآن کی تلاوت فرمائیے لیکن ہر مرتبہ ایک نئی چیز سامنے آئے گی جو روح و جان کو اپنے تحت تاثیر قرار دے گی۔ اور اس روحانی لذت کا احساس قرآن کے بلند مفاہیم کے ادراک کے تناسب سے ہوا کرتا ہے۔ ہر شخص اپنی علمی ظرفیت و ادراک کے لحاظ سے قرآن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس کو روحانی سکون بھی اسی حساب سے مل سکتا ہے۔

جذبہ آیات کی شعاعیں مسلمانوں کے اخلاق و روحانی جوش و حرکت کے ساتھ مکہ سے باہر چمکیں ایک طرف عیسائی دربار کے مرکز حبشہ میں مخالفین کے دباؤ اور نامناسب موقع و محل کے باوجود جعفر بن ابی طالب کی زبان سے تو دوسری طرف شہر مدینہ میں مصعب ابن عمیر کی زبان سے اسلام کی ترویج ہو رہی تھی اور مخالفین کے تمام اقدامات معاشرہ کے بنیادی فکری و عملی تغیرات اور اسلام و قرآن کی بلندی کی طرف میلان کی دعوت کو شکست دینے کیلئے ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ حبشہ و مدینہ کی طرح دوسری جگہوں میں بھی ناکامیاب رہے۔ قرآن نے اپنے پیغام کے ساتھ انسانوں کی اختیار میں وہ ضروری وسیلے بھی دیئے جن سے انسان حق و باطل میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکے۔ کیونکہ جب تک انسان ایک قسم کی وابستگی جہان ہستی سے تاریخ و ہستی کے بہ نسبت پیدا نہ کرلے انسانی زندگی کا مقصد بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

آج جبکہ نزول قرآن کو چودہ صدی سے زیادہ گزر گئے پھر بھی دنیا کے مختلف گوشوں سے تلاوت قرآن کی آوازیں آتی ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں کی عمارتوں سے بیابان میں ڈالے ہوئے خیموں سے۔ انسان کی وقتی اقامت گاہوں سے، مسافرت میں، مقصد تک پہونچنے کے لئے راہ پیمائی میں، دن کے ساعات و دقائق میں، رات کے سناٹے میں، بلندیوں پر چڑھنے اور اترنے میں مختصر یہ کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے میں ہر جگہ تلاوت قرآن کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں، صفحات دل پر مستعد ذہن پر اس کا ایک نقش چھایا رہتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کثرت کے باوجود اس کی تازگی اور طراوت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ قرآن اگرچہ زندگی کے مختلف اعمال و شئون و مجرائے عواطف میں رچ بس گیا ہے۔ لیکن ہر قسم کی تحریف سے پاک و محفوظ ہے۔

اس لئے یقین سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر بشری دانش و علم و ہنر قرآن کی تدوین میں دخیل ہوتا تو دیگر انسانی آثار کی طرح ایک معین وقت تک تو بہت ہی ممتاز ہوتا لیکن تاریخ و سرنوشت انسان میں اس کی تاثیر کم ہوتی رہتی اور آخر کار ایک دن وہ

پرانا ہو جاتا اور مرورِ زمانہ اس پر مہرِ زوال و مرگ ثبت کر دیتا ـــــ لیکن خداوند بزرگ نے جس کی توانائی و دانش غیر محدود ہے اس نے قرآن کریم میں سخن کو اس طرح کلمات کی تنظیم و تاثیر سے آراستہ کیا ہے کہ وہ اپنی تازگی کے ساتھ قالبِ ابدیت میں ڈھل گیا ہے۔

قرآن مجید جس نے تاریخ و تمدنِ بشر کے تمام ابعاد میں بذرِ توحید کو چھڑکنے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے رکھی ہے اپنے عمیق واقع کی توضیح و تبیین میں خود قاطع اور رسا ہے۔ عبث چیزوں کی نفی کرتا ہے۔ قشری نظریات اور کوتاہ اندیشی جو واقعیات کو لمس نہیں کر سکتے ان کی مذمت کرتا ہے ـــــ معارفِ الٰہی کے سلسلہ میں حق طلب و بلند پرواز انسانی روح کو اپنے عرفان. بلند معانی میں اس طرح مجذوب کر دیتا ہے کہ اس لحظہ کمال پر پہونچ کر اپنے ان تمام علائق کو جہانِ مادی کے نظام پر حاکم اقدار سے قطع کر لیتا ہے اور ایک وسیع تر افق میں نگاہوں کو گڑو دیتا ہے کہ جس میں دیگر ابعاد متبلور ہو جاتے ہیں۔

قرآن جس خدا کو دنیا والوں کو پہچنواتا ہے وہ ایک ایسی طاقت ہے جو جہانِ آفرینش کے موجودات کی ہر قسم کی تشبیہ سے دور ہے اور جس کی زبردست سنت تمام موجودات پر حاکم ہے اور جو عالم مفاہیم میں ایک بے نہایت مفہوم ہے۔ جس کی کوئی انتہا نہیں ہے قرآن اس خدا کی معرفی صراحت کے ساتھ اس طرح کرتا ہے "اس خدا کے لئے کسی کا کوئی مثل و مانند نہیں ہے۔ وہ سننے والا اور بینا ہے۔"[۱]

ہم جانتے ہیں کہ نظامِ ہستی کے موجودات یا تو مادہ ہیں یا طاقت ہیں اور ذاتِ پروردگارِ عالم کی تشبیہ مادہ یا طاقت سے قرآن کی نظر میں مطرود ہے۔ قرآن اس کی تعبیر

۱۔ سورہ شوریٰ آیت ۱۰

اس طرح کرتا ہے :-

"کوئی آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی ۔ لیکن وہ تمام آنکھوں کو دیکھتا ہے وہ لطیف و نامرئی اور تمام چیزوں سے آگاہ ہے ۔" (۱)

۵

قرآن انسان کو نظام ہستی میں تفکر دقیق اور صفات و حوادث میں تعمق کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ ایک مومن رہبر حوادث اور ان کے مقاصد میں تامل و غور کرنے اور انفس و آفاق میں اندر و باہر سے تفکر کرنے میں اس نتیجہ تک پہونچتا ہے کہ ہر حادثہ اپنے مخصوص راستہ میں ایک غایت کی طرف رواں دواں ہے ۔ اگر انسان کو نجات کی تلاش ہے تو اس کو چاہیئے کہ حوادث کے دائمی حرکت اور لقاء اللہ کی طرف جانے والے قافلہ سے اپنے کو ہم آہنگ کرلے ۔

قرآن خداشناسی کو ایک فطری اور اندرونی چیز سمجھتا ہے جو ہدف یاب آفرینش کے نفس قوانین سے جوش مارتا ہے اور مادہ پرست و خدا ناشناس حضرات جو اپنے ذہنی آئیڈیے کے معراج کے لئے ہاتھ پیر مارتے ہیں وہ اپنی خداجویانہ فطرت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں ۔ اسی طرح قرآن سیر توحید سے کجروی و انحراف کو " یعنی زردشت کی دوگانہ پرستی اور ہندوؤں کی سہ گانہ پرستی اور تثلیث مسیحیت کہ جس کے پیروکاروں نے سہ گانہ پرستی کو سابق آئین کی تقلید میں دین مسیح میں داخل کردیا ہے " شدت کے ساتھ رد کرتا ہے ۔ اور اس کی نظر میں اس قسم کی فکر حقیقت پر پردہ ڈالتا ہے ؛

قرآن کہتا ہے :-

جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا ان تین میں سے ایک ہے انہوں نے کفر اختیار کرلیا ۔ (۲)

---

۱ ۔ سورۂ انعام آیت ۱۰۳ ۔ ۲ ۔ سورہ مائدہ آیت ۷۳

اسی طرح جناب عزیز و مسیح کو خدا کا بیٹا ماننے کے نظریہ کو گذشتہ لوگوں کا پسماندہ عقیدہ سمجھتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

"یہود و نصاریٰ عزیر و مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں یہ وہ کلام ہے جن کو زبان سے کہتے ہیں اور اس بات میں یہ لوگ اپنے سے پہلے والے ان لوگوں کے پیرو ہیں جو کافر تھے ۔ (۱)

قرآن اپنے رسول کو مخاطب کر کے کہتا ہے :

"آپ کہہ دیجئے تعریف صرف خدا کے لئے مخصوص ہے خدا کا نہ کوئی بیٹا ہے نہ کوئی بیوی ۔ اور نہ عزت و اقتدار اس میں کوئی نقص پیدا ہوا ہے کہ وہ دوست و مددگار کا محتاج ہو ۔ برابر خدا کی بزرگترین اوصاف سے ستائش کیا کرو ۔ (۲)

مختصر یہ کہ قرآن ایک چھوٹے سے سورہ میں شرک کے ہر قسم کے تفکر کو باطل قرار دیتا ہے :

"اے ہمارے رسول کہہ دو کہ وہ خدا یکتا ہے ، وہ ہیچ سے خالی نہیں ہے ___ صمد کے منجملہ اور معانی کے ایک معنی یہ بھی ہیں ___ نہ کوئی اس کا بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کا مثل و ہمتا ہے ۔ (۳)

اور چونکہ بطور کلی مادہ مجوف اور ہیچ سے خالی ہے اور خود ایٹموں کے اندر جو دنیائے مادی کے تشکیل دہندہ ہیں ، حیرت انگیز فاصلہ و خلا موجود ہے ۔ سورۂ توحید کے اس آیت میں اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے کہ خدا از قسم مادہ نہیں ہے جو مجوف اور ہیچ سے خالی ہو ۔

۱۔ سورہ توبہ آیت ۳۰ ۲۔ سورہ اسراء آیت ۱۱۱ ۳۔ سورہ توحید

۵

پول کلارنس ابرسولد — مغربی دانشمند فزیکی کہتا ہے : کیا خدا ایک شخص ہے ؟ بعض کہتے ہیں ہاں لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ علمی نقطۂ نظر سے ایسا نہیں ہو سکتا ۔ علمی لحاظ سے خدا کو مادی نہیں تصور کیا جا سکتا کیونکہ وہ بشر کے قدرت و توصیفِ مادی سے خارج ہے ۔ لیکن بہت سے موجودات اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے آثار صنعت کو روشن کرتے ہیں کہ وہ غیر محدود عقل و علم و قدرت کا مالک ہے (۱)

وائن اولت — مشہور شیمی دان لکھتا ہے :۔

خدا مادی قوت و محدود نہیں ہے اور محدود فکر و تجربہ اس کی تعریف یا تحدید بھی نہیں کر سکتا ۔ خدا پر ایمان و عقیدہ ایک قلبی امر ہے ۔ اگرچہ علم کے ذریعہ علت اولیٰ و علت العلل کا اثبات غیر مستقیم طریقہ سے اس قلبی ایمان کی تائید کرتا ہے (۲)

وجودِ خدائے واحد کی اس طرح توصیف منطقِ علم ہے ۔ قرآن مجید بھی عالیترین حقائق علمی اور واقعیاتِ نظامِ آفرینش کے مانند ذاتِ احدیت کی توصیف کرتا ہے ۔ قرآن کے معارفِ عقلی کی اہمیت و ارزش اس وقت واضح ہوتی ہے ۔ جب خداشناسی سے متعلق آیات کی تحلیل میں ہم تطبیقی روش اختیار کریں اور اس سلسلہ میں یونانی ، بدھ مذہب زردشتی ، عرب جاہلی کے عقائد سے بھی بحث کریں کیونکہ یہ وہ مذہب ہیں جو اس وقت دنیا کے ایک حصہ پر غالب تھے ۔ اس بے طرفانہ اور دقیق مقابلہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہم کو اسلام کی حقانیت ـــــ جو اپنے تمام ابعاد میں توحیدِ خالص پر استوار ہے اور دوسری طرف عمل و فعالیت اور مقصد تک رسائی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور حقیقت یا مجاز

۱۔ اثبات وجود خدا ص ۵۸ — ۲۔ اثباتِ وجودِ خدا ، ص ۲۳۰

قرآن و معارف سرشار و قیمتی جن کو چودہ سو سال پہلے سے ہم کو سکھایا ہے اس کی طرف رہنمائی کرے گا۔

جو شخص سلاحِ دین سے مسلح ہے اور اسلامی شعور و آگاہی رکھتا ہے وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ سوائے اپنے سچے ایمان اور ان چیزوں کے جو اس کو اس کے بلند مقصد تک پہونچاتی ہیں کسی اور سے دل نہیں لگا سکتا۔

آخری رسول(۳) کیلئے مسیح(۴)

کی پیشین گوئی

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انبیائے ماسلف پر ایمان رکھنا مسلمانوں کا ایک اعتقادی رکن ہے۔ پوری تاریخ انبیاء شاہد ہے کہ ہر نبی کا مقصد انسان کو تمرانہ توحید تک پہونچانا تھا اور یہ ایک ایسی زنجیر ہے کہ اس کی آخری کڑی خاتم المرسلین[۵] پر ختم ہوتی ہے۔

تاریخ وحی کے اندر انبیائے الٰہی کے بلند مقام پر جو قرآن نے بھر دسہ کیا ہے اور اپنے ماننے والوں کو ان کی کتابہائے آسمانی پر ایمان لانے کی جو دعوت دی ہے اس کا مطلب ہے کہ قرآن ان کی حقانیت اور اصالت دین کی تصدیق کرتا ہے اور یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہر دور میں بشر کو پاک و اصیل وحی سے مربوط آئین، متحرک مفاہیم افکار پویا کے گرد رہنا چاہیئے بس صرف اتنی سی بات ہے کہ زمانہ میں خدا نے دین کی رہبری مخصوص پیغمبر کے سپرد کر دی تھی۔ اگر پیغمبروں کے پروگرام اور لائے ہوئے مذہب میں کوئی اختلاف ہے تو وہ تیز رو چرخ کی گردش اور پرشتاب تکامل کی بنا پر ہے اور اس وجہ سے ہے کہ بشر کی گزر گوناگوں منازل و مراحل سے ہوتی رہی ہے ورنہ بغیر کسی تفاوت کے تمام انبیاء سچے رہنما اور انسان کو ہدف الٰہی تک پہونچانے والے اور خدائے واحد کی طرف سے ایک ہی مذہب کو لانے والے تھے۔ صرف ضرورتوں کے لحاظ سے زمانہ کے ہمگام و ہم آہنگ ہو کر رہے

ہیں۔ قرآن کا اعلان ہے:

ہم پیغمبروں کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھتے (۱)

بعثتِ انبیاء کا پروگرام تو ازل سے طے شدہ تھا ــــــ مراتبِ انبیاء کا سلسلہ تدریجی ہدایتِ الٰہی کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس طرح انسان اپنی تاریخ حیات میں تدریجی طور سے آگے بڑھا ہے اسی طرح انبیاء نے بھی اپنی رسالت کو اسی پیشروی کے حساب سے ہم آہنگ کیا ہے اور انسانوں کو آنے والے رسولوں سے بھی آگاہ کیا ہے۔

اسی بنیاد پر رسول اسلام نے انبیائے سابقین کی رسالت اور انکی آسمانی کتابوں کی تائید فرمائی ہے۔ اور ان انبیاء نے بھی اپنے سے سابق انبیا کو قبول کیا ہے اور اپنے بعد آنے والے انبیاء کی خوشخبری دی ہے۔ اور اس طرح ادیانِ الٰہی کا ارتباط مذاہب حق کے معماروں کے واسطہ سے پورے یقین کے ساتھ اعلان پزیر ہوا۔

اگرچہ تنہا ایک پیغمبر کی بشارت کسی کے نبوت کی حقانیت پر قطعی دلیل نہیں ہے۔ البتہ ایک ایسا قرینہ ضرور ہے جس کے ذریعہ برگزیدگان خدا اور سچے انبیاء کی ایک حد تک پہچان ضرور ہو جاتی ہے اور نبوت کی خصوصیت کو اس کے چہرہ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

کسی نبی کی بشارت آئندہ نبی کے لئے اگر دلیل ہوتی تو چونکہ نام کا اعلان ایک امر قراردادی ہے یقیناً لوگ اس سے سوء استفادہ کرتے۔ اسی طرح وقت ظہور کا پہلے سے مشخص و معین کر دینا چارسو بیس اور دھوکہ دینے والوں کے لئے بہترین موقع ہوتا وہ پہلے ہی سے اس بات کے لئے زمین ہموار کر لیتے اور اس صورت

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۳۵

میں متعدد مدعی پیدا ہوجاتے اور افکار مردم پراگندگی کا شکار ہوجاتے ہیں ویسے یہ بات ضرور ہے کہ جو لوگ واقع ہیں اور دقتِ نظر کے مالک ہیں ان کے لئے ان جھوٹوں میں اور باطل و گمراہ عناصر کے درمیان سچے مدعی کا تشخیص کرنا دشوار نہیں تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ زیادہ تر لوگوں کی سطح بینش اور تفکر بہت پائین ہوتی ہے۔ ان کے لئے جب حق و باطل مخلوط ہوجائے تو اس کے درمیان چہرہ حق کی شناخت بہت مشکل ہوتی ہے۔ اور بہت سے لوگ باطل و جاہ پرست مدعیوں کے بہکانے میں آچکے ہیں۔ اور اب بھی آجاتے ہیں۔

اسی لئے آخری رسولؐ کے خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی علامتیں انسان کو مشخص کردیتی ہیں اور پھر اس کے بعد محقق حضرات کا کام ہوتا ہے کہ ان خصوصیات کے مالک کی تشخیص کے لئے چراغ راہ کا کام کریں اور نہایت خلوص و پاک طینتی کے ساتھ ان صفات کو مدعی رسالت پر منطبق کرکے مشکل حل کریں۔

اصولی طور پر نہ دین عیسیٰ نے اور نہ دیگر ادیان نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ دین مسیح ابدی و دائمی ہے اور عیسیٰ خاتم النبیین ہیں اسی لئے آخری زمانہ تک انجیل میں تحریف نہ ہونے کی گارنٹی نہیں دی گئی۔ اس کے برخلاف اسلام نے اپنے کو آخری دین اور کامل ترین دین سے متعارف کرایا اور اپنے لانے والے کو خاتم النبیین بتایا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اسلام کی آسمانی کتاب میں کسی قسم کی تحریف نہ ہونے کی گارنٹی دی جائے۔ اور ایسے لوگوں کے ہاتھ کوتاہ کردیے جائیں۔ جو اس میں تحریف کرنا چاہیں اسلام اور عیسائیت کی کتابوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عیسائیت فاقد ایک متن وحی تثبیت شدہ ہے اور اسلام میں اس قسم کا متن موجود ہے۔

انجیل مقدس کے جتنے بھی نسخے ہیں وہ اب تک ہماری دسترس میں ہیں اور دانشمندوں نے وسیع پیمانہ پر ان پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اور نقاد محققین جن کے پاس مختلف و متفاوت انجیل کے نسخے موجود ہیں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کتاب عہد جدید میں بہت زیادہ دگرگونی پائی جاتی ہے اور ایسے دلائل موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تمام اناجیل زیادہ تر شخصی افکار و عقائد پر تدوین کیے گئے ہیں۔

جان ناس تاریخ ادیان میں کہتا ہے :

سرگزشت مسیحیت ایک ایسے دیانت کی تاریخ ہے جس کی نشو و نما اس عقیدہ پر ہوئی ہے کہ خدا شارع دیانی کے جسم میں مجسم ہوگیا ہے۔ پوری عیسائی تعلیم اس قضیہ کے اردگرد گھومتی ہے کہ جناب عیسیٰ ذات الوہیت کی روشن ترین مظہر تھے۔ لیکن یہ آئین جو تجسیم الہٰی کے عقیدہ سے شروع ہوا تھا منقلب ہوگیا اور تحولات کے نتیجہ میں اس نے جنبۂ بشری پیدا کرلیا اور بشریت اپنی تمام کمزوریوں اور نارسائیوں اور تمائلات کے ساتھ ان میں منتقل ہوگئی ہے۔

مذہب کی داستان بہت لمبی ہے اور چونکہ مذہب بلندی و پستی، نام آوری و بدنامی سے بہت دوچار رہا ہے۔ اس لئے اس کی داستان پر معنیٰ، رنج و عبرت انگیز رہی ہے۔ دنیا کے کسی بھی دین میں روحانیت کے اتنے بلند مقاصد نہیں ہیں جتنے دین اسلام میں ہیں۔ نیز اسلام اسی اندازے سے اپنے اعلیٰ مقاصد سے بہت دور بھی نہیں رہا ہے۔

ان حالات کے باوجود ایسے شواہد و دلائل موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انجیل میں آئی ہوئی یہ لفظیں (روح راستی) اور (روح القدس)، (تسلی دہندہ)، سب کے سب پیغمبر اسلام پر منطبق ہوتی ہیں۔ انجیل میں

ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں سے فرمایا :

اس کے بعد میں تم لوگوں سے بہت زیادہ نہیں کہوں گا کیونکہ اس کائنات کا رئیس آئے گا اور مجھ میں کچھ نہیں ہے ۔ (۱)

• لیکن جب تسلی دہندہ کو باپ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجوں گا یعنی روح راستی جو پدر کی طرف سے صادر ہوگی وہ میری گواہی دے گی " (۲)

• میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے مفید ہے ۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو تسلی دہندہ تمہارے پاس نہیں آئے گا ۔ لیکن اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیجوں گا ۔ اس کے علاوہ بہت سی چیزیں میری نظر میں ہیں جن کو تم سے کہنا چاہتا ہوں مگر تم ابھی اس کے برداشت کی طاقت نہیں رکھتے ۔ لیکن جب وہ روح راستی آئے گی تو تم کو پوری سچائی کی طرف ہدایت کرے گی ۔ کیونکہ وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہے گی بلکہ جو کچھ سنتی ہے (یعنی جو وحی سنے گا) وہی بات کہے گی ۔ اور (وہ روح) تم کو آئندہ امور کی خبر دے گی اور وہ مجھ کو عظمت و جلال بخشے گی ۔" (۳)

" لیکن تسلی دہندہ روح القدس کے پدر اس کو میرے نام سے بھیجے گا ۔ وہ تمام چیزوں کی تم کو تعلیم دے گا ۔ اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ تم کو اس کی یاد دلائے گا ۔" (۴)

اگر ہم کہیں کہ تسلی دہندہ وہی روح القدس ہے [تو یہ درست نہیں ہو سکتا] کیونکہ روح القدس ہمیشہ حضرت عیسیٰ کے ساتھ رہتے تھے تو پھر حضرت

---

۱ ۔ یوحنا باب ۱۴ آیت ۳۰ ۲ ۔ یوحنا باب ۱۵ آیت ۲۶
۳ ۔ یوحنا باب ۱۶ آیت ۷ تا ۱۵ ۴ ۔ یوحنا باب ۱۴

عیسیٰ کا یہ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ ،

"جب تک میں نہ جاؤں گا وہ تمہارے پاس نہیں آسکتے" ؟

حضرت عیسیٰ نے فرمایا :

میرے بعد رہبر جہاں آئے گا وہ تم کو پوری سچائی کی ہدایت کرے گا اس کا مطلب یہی ہے انہوں نے اس آنے والے کے دین کے کمال کو پہچان لیا تھا اور ایسی رہبری حضرت محمدؐ کے علاوہ کس پر منطبق ہے ؟ اسی طرح جب مسیحؑ نے کہا :

"وہ میری گواہی دے گا" یا "وہ مجھے عظمت بخشے گا"

آپ خود ہی سوچیں حضرت محمدؐ کے علاوہ کون ہے جس نے عیسیٰ کو عظمت و جلال بخشا اور جناب مریم کو یہودیوں کے ناپاک الزام سے بری قرار دیا ۔

آیا یہ سارے اعمال روح القدس سے صادر ہوئے یا پیغمبر اسلام سے ؟ اس کے ساتھ اوپر کی آیات گواہی دیتی ہیں کہ :

"تسلی دہندہ" یا "روح القدس" یا "روح راستی" حضرت محمدؐ کے علاوہ کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا ۔ پہلی آسمانی کتابوں میں لفظ فارقلیط استعمال کیا گیا ہے جو لفظ "احمدؐ" اور "محمدؐ" کے برابر ہے ۔ لیکن انجیل کے ترجمہ کرنیوالوں نے لفظ "پریکلیتوس" کو جو ایک یونانی کا خاص لفظ ہے اور اس کے معنیٰ احمدؐ کے ہوتے ہیں " پاراکلیتوس " خیال کیا ہے اور انگریزی میں اس کا ترجمہ "تسلی دہندہ" کیا اکیا گیا ہے اور دوسری زبانوں میں اس کے شبیہ ترجمہ کیا گیا ہے ۔

ڈاکٹر موریس بوکای نے اس سلسلہ میں بہت اچھی شرح کی ہے وہ تحریر کرتے ہیں :

انجیل یوحنا کے یہ ابواب اصل مسائل اور بنیادی اہمیت کے حامل مسائل کو پیش کرتے ہیں کہ جو تمام عظمت و شکوہ کے ساتھ اساتذہ کی اپنے شاگردوں کے ساتھ خدا حافظی

کرنے کے لئے مخصوص کئے ہیں۔ جو چیز انسانوں پر حاکم ہے " اور یہ خود ایک کلمہ واپسین ہی درک کرنے کے قابل ہے " وہ آئندہ انسانوں کے لئے فائدہ بخش ہے جو حضرت عیسیٰ کے کے واسطہ سے پیش کیا جارہا ہے۔ نیز استاد کا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ ان وصیتوں اور احکام کو اپنے شاگردوں تک پہونچائے اور شاگردوں کے ذریعہ تمام بشریت کو ابلاغ کرے اور اس رہبر کی تعیین بھی کرنا چاہتا ہے جس کی اس استاد کے مرنے کے بعد انسان پیروی کریں۔

انجیل یوحنا کا متن صریحی طور پر اس رہبر کا نام یونانی لفظ " پاراکلتوس " سے ___ جس کو فرانسیسی زبان میں پاراکلت (فارقلیط) کہتے ہیں ___ واضح کرنا چاہتا ہے . . . . . . اس مسئلہ کو مزید توضیح کے لئے پیش کرنا چاہئے کیونکہ بہت ہی عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ اوپر والی آیت کے آخری ٹکڑے ___ یعنی وہ خود سے گفتگو نہیں کرے گا بلکہ جو کچھ سنا ہے (یعنی جس کی وحی کی گئی ہے) اسی بات کو کہے گا اور تم کو امور آئندہ کی خبر دیگا ___ کو " روح مقدس " کی طرف منسوب کر دیا جائے۔

یہ بات قابل درک نہیں ہے کہ " روح مقدس " کے لئے یہ مان لیا جائے کہ وہ خود سے گفتگو نہیں کرے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ جہاں تک میری معلومات ہیں کہ یہ مسئلہ جس کی تفصیل کے لئے منطق حکم دیتی ہے مطلقاً اس کی شرح و تفسیر نہیں کی گئی ہے۔ لفظ کا صحیح مطلب جاننے کے لئے متن یونانی کو معنیٰ بنانا ضروری ہے اور یہ اس لئے بھی بہت ضروری ہے کہ تمام لوگ کہتے ہیں کہ یوحنا نے انجیل کو یونانی زبان میں لکھا تھا نہ کہ کسی دوسری زبان میں۔ اب آپ اس مقام کو دیکھئے جہاں انجیل یوحنا کے مطابق حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں:

میں پدر سے استدعا کروں گا کہ وہ تمہارے لئے دوسرے فارقلیط کو بھیج دے گا۔

حضرت عیسیٰ بڑی وضاحت کے ساتھ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسانوں کے لئے دوسرا شفیع بھیجا جائے گا جس طرح وہ اپنی زمینی زندگی میں لوگوں کے نفع کے لئے خداوند عالم

کے نزدیک شفیع تھے ـــــ ایسی صورت میں منطق تام کی بنیاد پر ہم اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ یوحنا کے فارقلیط کو جناب عیسیٰ کی طرح ایک موجود بشری کے عنوان سے قبول کریں جو سننے اور بولنے کی طاقت رکھتا ہو یعنی یہ وہ استعداد ہے کہ یونانی انجیل یوحنا صریحی و قطعی طور پر اس کو لازم سمجھتی ہے ـــــــــ جناب عیسیٰؑ اعلان کرتے ہیں کہ خدا بعد میں زمین پر ایک بشر کو بھیجے گا جو ان چیزوں کا حامل ہوگا جس کو انجیل یوحنا نے بتایا ہے۔ اور یہ چیز صرف ایک کلمہ سے عبارت ہے کہ اس پیغمبرؐ نے خدا کی آواز کو سنا ہے اور وہ خدا کے پیام کو انسانوں کے لئے تکرار کرے گا۔ انجیل یوحنا کے متن کی منطقی تفسیر اسی طرح کی ہے اگر کلمات کے واقعی معنی بیان کئے جائیں۔

بہت زیادہ احتمال یہ ہے کہ "روح مقدس" کا کلمہ جو ہمارے پاس موجود متن میں ہے وہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہو۔ اور اس اضافہ کو عمداً کیا گیا ہو۔ اور اسی لحاظ سے عبارت کے ابتدائی معنیٰ، جو عیسیٰ کے بعد ایک پیغمبرؐ کے آنے کی خبر دیتی ہے۔ میں تغیر دیا گیا ہو۔ (۱)

فرانس کے بہت بڑے دائرۃ المعارف کے ج ۲۳ ص ۴۱۷۴ پر کلمہ محمدؐ کے شرح کے ضمن میں اس طرح تحریر ہے:

محمدؐ دین اسلام کے بانی اور خدا کے بھیجے ہوئے آخری پیغمبر ہیں۔ محمدؐ کے معنی حمد شدہ کے ہیں اور یہ "حمد" بمعنی تمجید و تجلیل سے مشتق ہے۔ ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ ایک دوسرا نام بھی جو اسی "حمد" سے مشتق ہے اور لفظ محمدؐ کا کامل مترادف ہے اور وہ "احمد" ہے جس کے بارے میں زیادہ احتمال یہ ہے کہ عربستان کے مسیحی حضرات اس لفظ کو "فارقلیط" کے تعین کے لئے استعمال کرتے

۱۔ توریت، انجیل، قرآن و علم ص ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۴

رہے ہوں۔

احمد یعنی بہت تعریف کیا ہوا اور بہت مجلل یہ لفظ "پریکلیتوس" کا ترجمہ ہے اور اشتباہاً لفظ "پاراکلیتوس" کو اس کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے۔ اسی لئے مسلمان مذہبی رائٹروں نے مکرر یہ بات لکھی ہے کہ اس لفظ سے مراد پیغمبر اسلام کے ظہور کی بشارت ہے۔ اور قرآن نے خود بھی بطور اعلان سورہ صف میں اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے انتھی۔

جس آیت کی طرف دائرۃ المعارف نے اشارہ کیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

جب جناب عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ میں تمہاری طرف وہی خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں کہ میرے سامنے جو توریت ہے میں اس کی حقانیت کی تصدیق کرتا ہوں اور تم کو ایک ایسے نبی کی بشارت دیتا ہوں جس کا نام احمدؐ ہے اور جو میرے بعد آنے والا ہے۔ اور جب پیغمبر اسلام دلائل و معجزات کے ساتھ لوگوں کے پاس آئے تو وہ کہنے لگے کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ (۱)

قرآن دوسری آیت میں کہتا ہے: (۲)

اس گروہ یہود و نصاریٰ پر خدا کی رحمت ہے جو اس نبی امی کی پیروی کرتا ہے جس کے اوصاف و خصوصیات کو توریت و انجیل میں دیکھا ہے۔ وہ نبی ان لوگوں کو نیکی پر آمادہ کرتا ہے برائیوں سے روکتا ہے پاکیزہ چیزوں کو ان پر حلال اور پلید چیزوں کو ان پر حرام قرار دیتا ہے۔ اور سنگین و پرمشقت تکالیف کے قید و بند کو ان کے ہاتھوں اور پاؤں سے اٹھا دیتا ہے۔ پس جو لوگ ایسے گرویدہ و پیرو ہوئے اور اس کو گرامی رکھا اور اس کی مدد کی اور اس کے نورانی و روشن پروگراموں کی پیروی کی یقیناً وہی لوگ کائنات کے نجات یافتہ ہیں۔

۱۔ س صف آیت ۶ ۲۔ سورۂ اعراف آیت ۱۵۶

رمزِ خاتمیت

اسلام کے اندر خاتمیت ایمانِ مذہبی کی ایک اصلی جڑ مانی گئی ہے یہ رسولِ اسلام کے بعد ہر رسول کی نفی کرتی ہے۔ جس وقت ہم اسلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ہرگز ہرگز پیغمبرِ اسلام کی خاتمیت سے غافل نہیں ہوتے۔ کون مسلمان ہے کہ محمدؐ کی یاد کے ساتھ ان کی خاتمیت کو یاد نہ رکھے؟ اور اس بات کی تردید کرے کہ قرآن وحیِ الہٰی کا آخری پیغام ہے؟

اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کے بارے میں ہم کو نہیں معلوم ہے کہ اس نے ختمِ رسالت کا اعلان کیا ہو یا کسی آسمانی شخصیت نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ اس کی نبوت ابدی اور رسالت جاودانی ہے۔ البتہ طلوعِ اسلام کو چودہ سو سال سے زیادہ ہو گئے اور اس طولانی مدت میں پیغمبرِ اسلام کو خاتم المرسلین کہا جاتا رہا کہ آپ نے شرائعِ گذشتہ کی تکمیل کر دی۔ اور بعثتوں کے آخری تکامل کی قدر و قیمت کو اپنے منطقی و اصولی پروگراموں سے واضح کر دیا۔ اس کے برخلاف دیگر دینی مکاتب صرف ایک زمانہ یا مخصوص جگہ کے لئے محدود تھے۔ صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو تمام رسالتوں کا جامع ہے اور وہ کسی کسی زمانہ یا کسی سرحد کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ اور خود قرآن مجید نے بھی سیمائے درخشانِ محمدؐ کو اسی عنوان سے پہچنوایا ہے کہ آپ کے بعد بابِ نبوت بند کر دیا گیا ہے۔

لیکن ضرورتِ بعثت جو سبب پویائی حیات ہے اور ختمِ نبوت جو مستمر ہے ان دونوں کے درمیان تناقض کو کیوں کر دور کریں؟ مقرراتِ اسلام کے ناقابلِ تغیر اصل اور نئے سنن

و مفاہیم کی جستجو کے درمیان کیونکر جمع کریں ؟

آج جبکہ ٹیکنیکی اور صنعتی تحولات نے انسان کو ایک موجود تو جُّو کی صورت میں ظاہر کیا ہے اور مسلسل ان تحولات کی کوشش یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں جدید اصول و نظام کی پیروی کی جائے تو پھر انسان اپنی تحول اجتماعی اور زندگی کو کس طرح اس مذہب کے حوالہ کر دے جو چودہ سو سال پہلے آیا ہو اور انسان کو ایک سنتہائے غیر متحول اور ثابت اقدار کی طرف دعوت دیتا ہو اور اس کو نظام دیرینہ میں ہر قسم کی تجدید نظر سے روکتا ہو ؟

جس اسلام نے مسئلہ ختم نبوت کو پیش کیا ہے وہی اس کا جواب بھی دے سکتا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انبیاء کے رسالتوں کی تجدید اور پے در پے رسولوں کو بھیجنے کی علت وہ تحریفیں تھیں جو آسمانی کتابوں اور آسمانی تعلیمات میں پیش آتی رہتی تھیں اور اسی لئے ان میں بشر کے ارشاد و ہدایت کی صلاحیت مفقود ہو جاتی تھی اور دوسرے نبی کو بھیجنا پڑتا تھا ۔ لیکن جب بشریت رشد و قابلیت کے اس مرحلہ تک پہونچ گئی کہ دینی تعلیمات و سنن کو تبدیل و تحریف سے بچا سکے اور اس کو نشر کر سکے تو تجدید رسالت کی بنیادی علت اور پیام نو کی ضرورت خود بخود ختم ہو جائے گی ۔

اور اسی بنا پر عصر ظہور رسولِ اسلام دیگر انبیاء کے اعصار سے مکمل طرح سے متمایز ہے کیونکہ بشر اس زمانہ میں بلوغ فکر کی منزل میں پہونچ جاتا ہے اور ختم رسالت کے سارے شرائط مہیا ہو جاتے ہیں ـــــــ اجتماعی بلوغ اور علم و دانش کا طلوع اور انسان کا اس درجہ تک پہونچ جانا کہ جہاں پر وہ خود آسمانی دین کا حافظ و مبلغ بن سکے یہ باتیں سبب بن جاتی ہیں کہ خاتمیت کے رکن مہم کا تحقق ہو جائے ۔ اور تبلیغ و ارشاد و ہدایت کا وظیفہ دانشمندوں اور علماء کے سپرد کر دیا جائے ۔ کیونکہ اس کے بعد خود بشر اس کتاب کی مدد اور اپنے رشد فرہنگی و اجتماعی کی کمک سے اپنے معنوی تحصیلات و تاریخی میراث کی حفاظت کر سکتا ہے ۔ اور آخری پیغمبرؐ کی آخری کتاب میں تحریف

و تغییر کو روک سکتا ہے کیونکہ اس کے بعد یہ رسالت ایک جماعت کے کندھوں پر آپڑے گی اور ایک آدمی اس کا مسؤل نہیں رہے گا جیسا کہ قرآن اعلان کرتا ہے :

"تم میں سے ایک ایسے گروہ کو ہونا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت کریں اور نیکی کا فرمان دیں اور برائیوں سے روکیں ۔ (۱)

تحولات اجتماعی کے سلسلہ میں انسان اس جگہ پہونچ جائے گا کہ جب پہلے دور کی جراحیوں کا اثر ختم ہو جائے گا اور وہ نظامی تدبر کے لئے آمادہ ہو جائے گا کہ نبوت ختم ہونے کے بعد پھر مستمراً ختم ہی رہے گی اور انسان اپنی بینائی و بصیرت و تعمق در دستاوردہائے وحی اور انتخاب درست کے ساتھ اپنی سرنوشت کو ایک شکل دے گا ان حالات میں ایک فکری و اجتماعی نظام لازم ہے تاکہ آدمی کے افکار و عمل کو ہر کرہ زیر بار و طاقت فرسا تعلقات و وابستگیوں سے آزاد کرے ، اور اس کے دائمی محاور کو عمل میں بھی اور فکر میں بھی سازمان عطا کرے ۔ قرآن مجید خطوط اساسی کے اس جاودانی معجزہ کو اور اس نظام کو پیش کرتا ہے اور انسان اسی فرہنگ سے جادہ کو طے کرتا اور آگے بڑھے گا ۔

اسلامی مفکر علامہ اقبال لاہوری کہتے ہیں :

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام دنیائے قدیم و جدید کے درمیان کھڑے ہیں جہاں تک ان کا سلسلہ منبع الہام سے مربوط ہے وہ دنیائے قدیم سے تعلق رکھتا ہے اور جہاں ان کے روح الہام کے پیچھے درکار ہیں وہ جہانِ جدید سے متعلق ہے ۔ زندگی ان میں دیگر منابع کو اکتشاف کرتی ہے جو ان کے خط سیر جدید سے لائق و شائستہ ہو۔ (۲)

آسمانی کتابوں میں تنہا قرآن وہ کتاب ہے جو زمانہ کے گزند سے محفوظ ہے

۱۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۰۴ ۔۔۔ ۲۔ احیائے فکر دینی در اسلام ص ۱۴۵

اور ہم اس کے اندر ایک غیر معروف حق کو دیکھتے ہیں اور یہ بات بھی قرآن کی ایک آیت میں کہی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

ہم نے خود اس کتاب کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں ۔ (۱)

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تجدید رسالت کی اہم ترین علت تحریف ہے ۔

دوسری طرف یہ توجہ کرنا چاہیے کہ تمام انبیاء پر اعتقاد ایک مسلسل اور کلی جریان پر عقیدہ ہے کہ جو تاریخ و معاشرہ کی ابتدائی شکل حاصل ہونے سے حق و باطل کے درمیان رہا ہے اور جب تک حق کو آخری اور قطعی کامیابی نہیں ہو جائے گی یہ سلسلہ باقی رہے گا ۔

شرائع و قوانین کے کسی ایک حصہ میں اختلاف دین کے اساسی اصول و ماہیت میں بے تاثیر ہے کیونکہ اس قسم کے اختلافات خطوط فرعی سے مربوط ہیں یہ مکاتیب کی ماہیت میں بنیادی اختلاف نہیں ہے ۔ اصولی طور پر انحرافات و کجرویوں کی اصلاح مخصوصا و متعدد پروگراموں کے ذریعہ ممکن ہوتی ہے ۔ اسی لئے اگر برنامہ و روش کے لحاظ سے انبیاء کے اندر ناہم آہنگی دیکھی جائے تو وہ ہدف و جہتی کے لحاظ سے اصولی نہیں ہوتی ہے ۔ قرآن مجید کہتا ہے :

انبیاء کے بعد عیسی ابن مریم کو اس حال میں بھیجا کہ وہ موسیٰ کی توریت کی تصدیق کرتے تھے ۔ (۲)

قرآن مجید نہ تو کتب گذشتہ کو بے اعتبار بتاتا ہے اور نہ سابق انبیاء کی نفی کرتا ہے بلکہ اس کے برخلاف تمام سابق انبیاء کی رسالت کو قبول کرتا ہے اور ان کی تائید کرتا ہے

۱۔ سورہ حجر آیت ۹ ۲۔ سورہ مائدہ آیت ۴۶

اور بزرگ انسانوں کے رنج کی تعریف کرتا ہے ۔ یہودی و عیسائی رہبروں کا مکرر تجلیل و احترام کے ساتھ ذکر کرتا ہے ۔ ان تمام شخصیتوں کی بزرگداشت اور تجلیل کیا صداقت و امانت و مبنی بر نزول وحی کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے؟ حالانکہ انہیں مکاتب کے بعض پیرو قرآن کو مکتب نو قرار دے کر شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کرتے تھے اس بات سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کتاب رقابت و ہم چشمی اور بشری محدود تمایلات سے کتنی دور ہے اور ہوا پرستی و جاہ طلبی سے کتنی بیگانہ ہے ۔ قرآن خود اعلان کرتا ہے :

ہم نے اس کتاب کو تم پر بر حق نازل کیا اس حالت میں کہ پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی حفاظت کرتی ہے ۔ (۱)

اور چونکہ دین کی جڑیں آدمیوں کی فطرت میں موجود ہیں لہٰذا اس الٰہی صدا کے مقتضیٰ کی بنا پر بستر بینش و عمل پر متشکل ہوتی ہے اور مختلف تعدد سے الگ ہے قرآن کہتا ہے :

سیدھے دین کی طرف آؤ کیونکہ خدا نے فطرتِ خلق کو اس پر پیدا کیا ہے (۲)

پس اگرچہ انسان ان سنتوں پر مشمول ہے جو پدیدہ ہائے جہان پر حاکم ہیں اور حوادث کے ارتباط و قانون تکامل سے معنوی پیوستگی پیدا کرتی ہیں لیکن اس کی سعادت کا راستہ ایک ہی میں منحصر ہے اور مذہب اس کو ہدف خاص ، جہت خاص ، اور مسیر خاص بخش سکتا ہے ۔

منتسکیو کہتا ہے :

بشری قوانین کی ماہیت یہ ہے کہ گوناگوں حوادث کی مطیع ہو جائے ۔ یعنی حوادث اس میں اثر کرتے ہیں ۔ لیکن آسمانی قوانین حوادث کی بنیاد پر اور انسانی

۱۔ سورہ مائدہ آیت ۴۸ ۲۔ سورہ روم آیت ۲۹

کے ارادہ کے متغیر ہو جانے سے تغیر قبول نہیں کرتے۔ بشری قوانین برابر اچھے حل کو مد نظر رکھتے ہیں۔ لیکن ملکوتی قوانین بہترین راہ حل کو پیدا کرتے ہیں۔ اچھے حل کا راستہ ممکن ہے متعدد ہو کیونکہ خوبیاں مختلف جنبے اور گوناگوں انواع رکھتی ہیں لیکن بہترین راہ حل منحصر بہ فرد ہے اسلئے قابل تغییر نہیں ہے ــــ انسان بشری قوانین کو بدل سکتا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے ایک قانون ایک زمانہ میں مفید ہو اور دوسرے زمانہ میں مفید نہ ہو لیکن مذہب برابر بہترین قوانین کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور چونکہ اس سے بہتر پیدا کرنا ممکن نہیں ہے لہذا وہ قابل تغییر بھی نہیں ہے۔ (۱)

یہی وجہ ہے کہ اگر قوانین الہٰی سے پشت پھیر لیں اور مقررات بشری کے دامن میں پناہ لیں تو در حقیقت قانون مذہب کے آزاد و وسیع جنگل سے نکل کر تنگ تعلقات ناہموار و باریک و دیگر محدود بشری گلی میں داخل ہو جائیں گے۔

رسول خدا اور دیگر انبیاء کی رسالت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ان حضرات کی وحی ایک وقتی پروگرام کے پیش نظر تھی جو طلوع اسلام کے بعد اور ان کے مذہبی سسٹم میں ضعف و کمزوری پیدا ہو جانے کی وجہ سے ان کے پروگرام زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔

لیکن اسلامی نظام اتنا پرارزش ہے کہ تکمیل ساز مان نبوت کیلئے " جو منطقی طور پر منسجم اور بہت ہی مستحکم ہے " اس کے تمام وسیع ابعاد کا احاطہ کئے ہے اور انبیاء کے تمام پیش کردہ اصول کا جامع ہے جو انسان کو اصول اجتماعی کے سلسلہ میں اور اس کو اپنی مادی و معنوی زندگی میں جن چیزوں کی احتیاج ہے ان سب سے بے نیاز کر دیتا ہے لیکن دیگر مذاہب مادہ و معنی کے لحاظ سے اس قسم کی جامعیت نہیں رکھتے۔

۱۔ روح القوانین ص ۲۵

معاشرہ کے انحراف وکجروی کے اصلاح کے سلسلہ میں دیگر انبیاء نے جو طریقے اختیار کیئے تھے اور اپنی زندگی میں جو فکری و عملی خط سیر معین کیئے تھے مذہبی پیشواؤں نے انہیں طریقوں کو منابع جو شان اسلامی سے بہرہ برداری کرتے ہوئے اپنے ذمہ لے لئے اور اسلامی منابع کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں اور قرآن جو اسلام کے تمام اندیشی نظام کا تغذیہ کرتا ہے۔ اور ان کو معتبر قرار دیتا ہے۔ وہ حرکتوں کی سیر کو معین کرتا ہے اور اسلام کے گوناگوں قوانین کا خالق ہے کہ اس کے وسیع اصول و موازین کے دائرہ سے کوئی مسئلہ باہر نہیں ہے۔ نیز برگزیدہ شدہ تمام تعلیمات الٰہی کے مفہوم و معنی کو اپنے دامن میں لئے ہے۔

بشر جب رشد انسانیت کے مرحلہ میں پہونچ جاتا ہے اور حقائق کلی و معارف و قوانین الٰہی کے دریافت کی طاقت پیدا کر لیتا ہے۔ تو علماء اور دانشمند انبیاء کے جانشینی کے مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں تاکہ انسان کے حوزۂ فکر و اندیشہ میں اصلی معیار کو جگہ دے سکیں۔ اور یہی لوگ اپنے دین کے بلند مقاصد تک رسائی کیلئے اور انحراف و تحریف سے اجتہاد و مبارزہ کو اپنے ذمہ لے لیتے ہیں اور پھر موازین الٰہی کی صحیح جہت میں تبلیغ کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں نے لوگوں کو حوادث میں دقیق مطالعہ اور فہم و استدلال اور نظام ہستی پر حاکم روح کی شناخت کے لئے دعوت دی ہے ـــــ عقل و تجربہ کی طرف دائمی توجہ اور دقیق مقامات کی نشاندہی اور فطرت و تاریخ کیلئے بعنوان منبع معارف آسمانی جس اہمیت کی یہ کتاب مقدس قائل ہے وہ سب خاتمیت رسالت کے اندیشہ ہائے متنوع کے چہرے ہیں اور تاریخ بشر میں نئی حکومت جنبش کے نمایاں کرنے والے ہیں۔

طرح ہائے ذہنی اور واقعیات خارجی کی درآمیختگی کے لحاظ سے تقریباً

پندرہ قرن سے بشر پر بار مسئولیت کے قبول کیلئے اپنی لیاقت و شائستگی کا اظہار رکھتا ہے اور اپنی علمی و دینی میراث کی نگہبانی کر سکتا ہے اور تفسیر و تحلیل کے مرحلہ میں عمیقاً اپنی واقع بینی کی نشاندہی کر چکا ہے۔

یہ ساری چیزیں خود نہایت وقت کے ساتھ آسمانی آیات کی حفاظت کیلئے انسان کی قابلیت و استقلال و آمادگی کی دلیل ہیں اور دین کی راہ تعلیم میں تلاش و تفسیر اور وظیفۂ تبلیغ کا عہدہ دار ہونے کا قرینہ ہیں۔

جب آخری دستور الٰہی انسان کے پاس پہنچا تو پھر نئے رسول کے آنے کی گنجائش ہی ختم ہو گئی۔ اس کو یوں سمجھیں کہ اگر ہم آثار قدیمہ کے انکشاف کے لئے زمین کے ایک ٹکڑے کو ضرورت سے زیادہ آخری بار کوشش کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس ٹکڑے کے اندر اب کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں رہ گئی ہے (کیونکہ اگر ہوتی تو آخری کوشش میں ظاہر ہو جاتی۔ مترجم) یہی صورت ان مسائل کی ہے جو وحی سے مربوط ہیں ــــ جب نبوت مختلف مراحل سے عبور کر کے اپنے کمال و ارتقا کے آخری درجہ تک پہونچ گئی اور باعتبار وحی تمام مبہم و تاریک گوشے ذہن انسان میں واضح و روشن ہو گئے تو پھر کوئی ابہام باقی نہیں رہیگا اور اسی جگہ سے نبوت اپنے انتہائی نقطہ پر پہونچ جاتی ہے۔ اور وحی کے نہ ختم ہونے والے منبع کے ارتباط سے ایک اجتماعی و فرہنگی ارزشی نظام کے سہارے ایک بُعد زمانی سے وسیع تر حالات میں اپنی زندگی کے بقا پر قادر ہوتی ہے۔

پیغمبر اسلام ایک واضح بیان میں ارشاد فرماتے ہیں:

نبوت ایک گھر کے مانند ہے جس کی تعمیر کا کام تمام ہو گیا ہے، صرف ایک اینٹ کی جگہ باقی ہے وہ میں رکھدوں گا۔ (تفسیر مجمع البیان۔ س احزاب، آیت ۴۰)۔

اگرچہ پیامِ الٰہی کے ابلاغ کی ماموریت اور زمانہ میں مخلوق کی دستگیری اور بلوغ فکر و پختگیٔ اندیشہ کا سلسلہ انبیاء سے ختم ہو گیا ہے لیکن جہانِ انسان اور جہانِ غیب کے درمیان روحانی و معنوی رابطہ اور مجرائے تصفیہ روح کے ذریعہ مقاماتِ عالی پر پہنچنے کا راستہ اور کسبِ اخلاص کے سلسلہ میں کوشش ہرگز ہرگز قطع نہیں ہوئی ہے۔

انسان جو وسیع و خلاق ابعاد رکھتا ہے۔ وہ نفسانی مسلسل کوشش کے زیرِ سایہ اپنی بالقوہ استعداد و ظرفیت کو فعلیت میں پہنچا دیتا ہے اور اس کو اتنا توانا کر دیتا ہے کہ وہ جہانِ غیب سے ارتباط میں قرار پذیر ہو جائے۔ اور جہانِ مادہ میں ڈوبے ہوئے لوگ جن چیزوں کو نہیں دیکھتے اور نہیں پہچانتے وہ ان کو دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے اور اس کوشش و سعی میں لگا رہتا ہے کہ انسان کا انسانی چہرہ خلیفۃ اللہ فی الارض کی صورت میں ظاہر ہو اور وہ ان نئی قدر و قیمت سے جو اس کی زندگی کو مفہوم بخشتی ہیں بہرہ یاب ہو۔

اور اسی لئے بہت سے ایسے افراد ہیں جن کی مذہبی بینش بہت ہی بلند ہے اور اصیل و سرشار معنویت سے بھی بہرہ یاب ہیں۔ لیکن مقامِ رہبری یا نگاہ رفیع رسالت تک نہیں پہونچ سکے۔ اشراق و الہام کے دروازے تمام اُن لوگوں کے لئے کھلے ہیں جو اپنی فطرت و باطن کو گندگیوں سے اور گناہ کی تاریکیوں سے پاک رکھتے ہیں اور اپنے دل و جان کو معرفتِ الٰہی کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔

نہ تو کبھی فیضِ معنوی قطع ہوتا ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی کمی و نقصان کا ظہور ہوتا ہے۔ بلکہ اس اصلی اور جوش مارتے ہوئے منبع سے عمیق و مستقیم رابطہ سے انسان کا فائدہ اٹھانا میزانِ کشش و ظرفیت کی صلاحیت اور ہر شخص کی روحانی طاقت سے وابستہ ہوتا ہے کہ وہ اس بے حساب و عام فیضان سے کس طرح برابر فیض حاصل کر سکتا ہے؟

مادہ پرستوں کا جواب

مادہ پرست حضرات ہم سے کہتے ہیں۔ جب فطرت کا عمومی قانون بنیادی طور سے تغیر و تحول مانا جاتا ہے اور دنیا کی کسی چیز کو دوام و ثبات نہیں ہے تو پھر اسلام کیونکر دائمی ہو سکتا ہے؟

پہلی بات صحیح اور قابلِ دفاع ہے لیکن اسی کے ساتھ تمام حقائق کو بیان نہیں کر رہی ہے یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ کائنات کی ہر چیز متغیر ہے لیکن جو چیز فطرت میں تغیر پیدا کرتی ہے اور اس کو نیست و نابود کرتی ہے وہ مادہ اور حوادث ہیں۔ نہ کہ نظامات و قوانین! نظام طبعی اور نظام اجتماعی جو ناموس طبیعت پر منطبق ہیں وہ بھی تحول و تغیر سے دور ہیں۔ قوانین کی خصوصیات میں یہ بات ہے کہ وہ زمانہ کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور کلی ہوتے ہیں اور قوانین کی یہی خصوصیات ہیں جنھوں نے قوانین کو یہ طاقت بخشی ہے کہ وہ اپنے دوام کو محفوظ رکھ سکیں۔

ستارے اور کرات ظاہر ہوتے ہیں، گردش کرتے ہیں۔ نور بخشتے ہیں طاقت عطا کرتے ہیں لیکن پھر بھی فرسودہ ہو جاتے ہیں لیکن قانونِ جاذبہ اپنی طاقت پر اسی طرح باقی ہے۔ اسی طرح سنتِ الٰہی کی بنیاد پر انسان مائل بہ ترقی ہوتے ہوئے دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اور پھر عمر کا ایک حصہ بسر کرنے کے بعد پژمردہ ہو جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ ہر انسان کے لئے موت اس کی نوشتۂ تقدیر

ہے۔ لیکن انسان و جہان پر حاکم اصول و قوانین پائیدار و غیر قابل تغییر ہیں۔ مختلف درجات کے ساتھ حرارت کثرت کے ساتھ دنیا میں پائی جاتی ہے لیکن پھر سرد ہو جاتی ہے۔ برخلاف قانونِ حرارت کے کران کے نابودی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے ــــــــــ اگر جعلِ قوانین میں انسانِ طبیعی مورد نظر ہو اور نہاد و ساختمانِ وجود بشر محور تدوین قانون قرار پائے تو عصری تحولات اس قسم کے قوانین میں کوچکترین دگرگونی بھی پیدا نہیں کر سکتے کیونکہ عنصر و ذاتِ انسان تغییر پذیر نہیں ہے ــــــــــ بانیٔ اسلام نے خود تو اس دنیا سے آنکھیں بند کر لیں لیکن ان کے الٰہی قوانین جو سرشت آدمی کے پیش نظر وضع کئے گئے ہیں وہ زندہ جاوید رہیں گے اور قوانین اسلام کے ثبات و ابدیت و پائیداری کا راز یہی ہے۔

اسلام کوئی سیاسی و اجتماعی پدیدہ نہیں ہے بلکہ اسلام ایک ایسے اصول و فروع کا سلسلہ ہے جس نے پرتو ہستی سے نور حاصل کیا ہے اور ایسا قانون و جہان بینی ہے کہ فطرتاً چہرہ نہیں بدل سکتا۔ اسلام نہ کوئی قومی یا مقامی دین ہے اور نہ نسلی دین ہے۔ یہ نہ صرف عرب سے متعلق ہے اور نہ صرف عجم سے۔ خود قرآن نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے:

"اے انسانو ہم نے تم سب کو عورت اور مرد سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف شعبوں (اور قبیلوں) میں کر دیا ہے تا کہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ تم میں خدا کے نزدیک سب سے بزرگ وہی ہے جو خدا کے نزدیک تمام لوگوں میں از روئے تقویٰ بہتر ہے۔" (سورہ حجرات آیت ۱۲)

دوسری جگہ اعلان کیا ہے:

"اے فرزندانِ آدم کہیں تم کو شیطان فریب نہ دیدے جیسا
کہ تمہارے ماں باپ (آدم وحوا) کو جنت سے باہر کر دیا تھا
اور ان کے جسم سے لباسِ عزت اتروا دیا تھا"۔(۱)

دانش وتمدن کے وسیع دامن اور پائیدار قوانین سے تمسک اور ضروریاتِ بشر کی کچھ دگرگونیاں کوئی مشکل نہیں پیدا کرتیں کیونکہ انسان کے رفتارِ تکامل میں کچھ ضرورتیں ہیں جو طبیعتِ زندگی اور آدمیوں کی عمقِ روح سے پیدا ہوتی ہیں اور یا پھر انسان کے جسمی سازمان سے مربوط ہوتی ہیں جو مسلسل زمانہ میں محکم ہوتی ہیں اور پائیداری ودوام سے بہرہ یاب ہوتی ہیں۔ اور جب تک انسان اس کرۂ خاکی پر موجود ہے اس وقت تک حریمِ ذاتِ آدمی اور وہ عناصر جوان خواہشات کی بنیاد ہوتے ہیں ان تک دستِ تحول نہیں پہونچ سکتا تاکہ ان کو زیروزبر کرسکے۔

ہاں کچھ ضرورتیں ایسی بھی ہیں جو زمانہ کے امکانات اور طبیعت سے بہرہ گیری پر مربوط ہیں جو نئے عوامل کے سلسلے کے آجانے کے بعد شرائطِ زندگی کے ساتھ متغیر ہو جاتی ہیں۔ اور اوضاع واحوال کی دگرگونی، ٹیکنیکی تحولات، نئی خواہشات کے ساتھ معاشرہ کو روبرو کر دیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے صرف انہی امور میں تغییر و تبدیل ہوتی ہیں پہلے والے میں نہیں! لیکن اس کے ساتھ یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان تمام ارزشمند اور اصیل معیاروں کو زمان ومکان کے تحت شرائط قرار دیدے اور نوخواہی کے بہانہ سے ہر امرِ خلاق کو پس پشت ڈال دے۔

عوامل تمدن کی وسعت کی بنا پر ضروری آلات کی تبدیلی اور نوآوری یکطرفہ فرعی مقررات وقوانین کا سبب ہوتے ہیں جو زمانہ کے مخصوص شرائط

۱۔ سورۂ اعراف آیت ۲۵

کی بنیاد پر مسائلِ اسلامی کے شناسا حضرات کے سہارے معین ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ثابت اصولِ کلی کے ایک سلسلہ سے بہرہ گیری کے ساتھ استنباط و مرحلۂ اجراء میں آتے ہیں۔ لہٰذا تغیر پذیر امور کے لئے ناپائیدار قوانین وضع کئے جا سکتے ہیں مگر اسلام کے وضعِ قانون کے سسٹم میں اس قسم کے دو دستہ مسائل میں بنیادی تفاوت موجود ہے مثلاً اسلام نے حفظِ امنیتِ داخلی، تجارتی روابط، دوسرے ملکوں سے مناسب سیاسی ربط، دفاعی مسائل، علاج و معالجہ جیسے امور میں پوری ذمہ داری با صلاحیت عادل اسلامی حکومت کے سپرد کر دی ہے۔

جو چیز بیان ہے وہ تغیر پذیر مسائل ہیں جو ممکن ہے ہر زمانہ میں اس کے اعتبار سے ان کی خصوصیات اور اہمیت بدل جائے اس بنا پر اسلامی جہان بینی ایک زندہ و فعال شی ہے کہ جس نے متحول امور کے لئے قانون وضع نہیں کیا بلکہ معیارِ کلی و مہم جانب کو بیان کر دیا ہے۔

حیات اجتماعی میں طبیعت سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور سطحِ اطلاع کو اوپر لے جانے کے لئے یہ تحول ہوتا ہے۔ لیکن جو مسائل ذاتی و فطری اصول سے الہام حاصل کرتے ہیں اور وجودِ آدمی کی حقیقت سے آمیختہ ہیں ان کے لئے اسلامی قوانین ثابت ہیں وہ سیرِ زمان و مکان کے ساتھ معرضِ طوفان میں قرار نہیں پکڑتے۔ مثلاً فرزند کے ساتھ والدین کی محبت فطرت کی متعاقب و متوالی جلوہ ہے۔ اور جو حقوق اس بنیاد پر وضع کئے جاتے ہیں۔ مثلاً میراث یہ جنبۂ جاودانگی رکھتی ہے اسی طرح انسان کا تشکیل خانوادہ کا محتاج ہونا عام اور وسیع قانون ہے۔

اسی لئے جب سے پیکرِ روحِ بشر میں فکر و اندیشہ نے سر ابھارا ہے اسی دن سے تمام نشیب و فراز تمدن کے طلوع و افول میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اسی طرح انسان

کا اجتماعی ہونا، تشکیل خانوادہ کی ضرورت ہونا اس کے زندگی میں پائے جاتے ہیں اور اسی بنیاد پر جو موازین ان سے مربوط ہیں ان کو بطور استمرار جاری رہنا چاہیئے چونکہ آج کے انسان کے خواہشات گذشتہ زمانہ کے خواہشات کے ساتھ اس کی ذات کی گہرائی میں موجود ہیں ۔ اور کسی طرح انسان کی اندرونی مستقل ہویت بنیادی دگرگونی کے ساتھ نہیں پائی جائے گی اور کوئی چیز اس کو اس کے راستہ سے نہ روک سکتی ہے اور نہ اس کی راہ بدلنے والی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے خانگی روابط، عمومی روابط، حقوق افراد کے اصول کے لئے پائدار قوانین وضع کئے ہیں اگر یہ قوانین پایۂ عدالت پر استوار ہوں تو پھر اس میں کیسے تغییر ہو سکتا ہے؟ اور عدالت و فطرت سے اور کس سمت کی طرف تغییر دیا جا سکتا ہے؟

اس کے علاوہ مفاہیم اصلی جیسے: وظیفہ شناسی، امانت داری، نوع دوستی یا مثلاً ظلم و خیانت و جھوٹ جو فرد اور اجتماع دونوں میں پائداری کی صورت میں موجود ہیں وہ ماہیت ثابت اور تغییر ناپذیر کو بیان کرنے والے ہیں کہ فطری طور سے اس ثبات و استمرار کو ان سے مربوط قوانین میں بھی عمومیت دی جانی چاہیئے ۔ چاہے ان کی اجرائی صورت دگرگون ہو ۔

لہٰذا عام مقررات اور ان کی وسعت واسانی جو انسان کی شناخت حقیقت کے معیار کے ساتھ اور اس کے حتمی نوشتہ تقدیر کے ساتھ مدون ہوئے ہیں ۔ اور جریان ہستی کے کلی خط سیر کے ارتباط میں ایک انتہا ہیں جو حیات بشری کے لئے وجود رکھتے ہیں وہ عام مقررات معتبر اور لائق اہمیت ہیں اور ہر زمانہ میں انسانوں کے ارشاد وادارہ و سازندگی کے باعث ہوئے ہیں ۔

اسلام عمومی طور سے رفع ضرورتوں کے لئے جو دائمی قوانین ہمارے ہاتھ میں نہیں دیتا اس کی علت یہ ہے کہ تدوین قانون میں جس طرح نظام درونی و فطری میں بے توجہی کمزوری کی نشانی ہوتی ہے۔ اسی طرح ناپائدار مسائل کو نادیدہ تسلیم کرنا قانون کے فارمولوں کے تہیہ و تنظیم میں خود ایک کمزوری کی نشانی ہوتی ہے۔

دوسری طرف ہم کو یہ معلوم ہے کہ انسان خود محیط و عوامل اجتماعی کا پرجوش چشمہ ہے۔ وہ اپنے کو بلندی و رفعت عطا کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کجروی غلطیوں سے محفوظ نہیں ہے۔ کبھی تو وہ اپنے واقعی مصالح کی طرف گامزن ہوتا ہے لیکن کبھی اپنے مصالح کے برخلاف معصیت کی طرف چل پڑتا ہے۔ اس کو اس بات کا یقین رکھنا چاہیئے کہ ہر پدیدۂ نو ظہوری ایک پرارزش نظام میں مقبول و تمدن آفرین نہیں ہوا کرتا۔ اور کوئی منطقی عقل بھی اس فکری و عقیدتی سسٹم کی پشت پناہی نہیں کرتی۔

کوئی بھی ایسی روش جو آدمی کو ایک بہتر زندگی اور سعادت مندانہ حیات کی طرف لے جائے تو اسلام اس کا مخالف نہیں ہے بلکہ وہ کسی ایسی تلاش کو ضائع بھی ہونے نہیں دیتا کیونکہ اسلام کا عقیدہ ہے کہ کائنات جتنا بھی ہو سکے اس کو بار آور افکار کی طرف سیر کرنا چاہیے۔ اور اس راستہ میں یہی کوشش و اعتقاد بصورت ایک عامل مؤثر انسان ساز حرکت کو وجود میں لاتا ہے۔

اسلام میں جس چیز کی طرف بہت زور دیا گیا ہے وہ روح و معنائے زندگی اور وہ راستے ہیں جو اسی اندرمان پر ختم ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلام نے افراد کو اپنا راستہ اپنانے اور ظاہر زندگی میں کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اور یہ خود ایک ایسا عامل ہے تاکہ لوگ زمانہ کی پیشرفت سے پیدا ہونے والے مقتضیات کے مطابق کسی نقص سے دوچار ہونے میں تضاد و تصادم کی صورت میں اپنے کو آگے

کی طرف بڑھا سکیں اور نئے مرحلہ میں وسیع وکشادہ و بالاتر سطح تک رسائی حاصل کر سکیں

چونکہ اسلام انسان کے جہت کمال میں ایک مخصوص ہدف رکھتا ہے اور واقعیات پر بھروسہ کرتا ہے۔ عقل و شرع کے باہمی ارتباط کو ناقابل اجتناب سمجھتا ہے۔ جس طرح وہ عقل کو منابع احکام میں شمار کرتا ہے۔ اسی طرح مخصوص ضابطہ کی بنیاد پر بہت سے مشکلات کے حل کو عقل کے حوالہ کر دیتا ہے۔

جن اسباب کی بنا پر اسلامی تعلیمات نے جاودانگی کا جنبہ پیدا کیا ہے اور احکام کو تحرک بخشا ہے کہ ہر زمانہ میں اس کی رفتار سے فائدہ اٹھایا جائے وہ عاول اسلامی حکومت کو وسیع اختیارات دینا ہیں۔ اور اس بات کے لئے کہ لوگ کسی مسئلہ میں بغیر تکلیف کے نہ رہ جائیں حکومت اسلامی مجاز ہے کہ موقعیت و جدید شرائط کے ماتحت اصول کلی سے استناد کرتے ہوئے زمانہ کے مقتضیات کے مطابق مناسب و ہم آہنگ قوانین وضع کرے ______ اور اس قسم کی برنامہ ریزی کیلئے حکومت اسلامی کو اختیار کی سپردگی اس وجہ سے ہے کہ مسائل اسلامی کے ماہرین نئے حالات کے مطابق مناسب طریقہ اختیار کریں۔ اور اجتہاد و آزادی فکر سے استفادہ کرتے ہوئے معاشرہ کی ضرورتوں کو خصوصاً آج کی متحرک زندگی کے اوضاع کو ٹیکنالوجیوں کے پیشرفت کے پیش نظر جو مسلسل رو بترقی ہے اور نئے پروگرام کا خواہ کتنا ہی احساس ہو، شریعت کے ناقابل تغیر حالات پر منطبق کریں۔ یعنی ضرورت تکامل اس بات کو واجب بناتی ہے کہ معاشرہ کی رفتار زندگی نئے سانچہ میں ڈھل جائے اور معاشرہ کی صورت بنیادی طور سے دگرگوں ہو جائے۔

اس قاعدہ کی بنا پر ہم ایسے نظریہ تک پہونچ جاتے ہیں جس سے حساس ترین پیچیدہ مسائل بھی حل وفصل کے قابل ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح صرف واقعی فساد و صلاح امت اسلامی کے اندر وضع قوانین و صدور احکام کی علت نہیں ہوتا۔ البتہ اس قانون و حکم کو اجرا کے ترجیح کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ امت اسلامی بہت سے مصالح اپنے دامن میں لئے ہے۔ اور اسی زندہ اصل کی بنیاد پر اسلام نے اسلامی دانشمندوں اور فقہاء کو یہ اجازت دے رکھی ہے کہ اگر کہیں پر دو متضاد چیزوں میں مصلحت موجود ہو تو کم اہمیت والی مصلحت کو زیادہ اہمیت والی پر فدا کر دینا چاہیئے اور مسئلہ کو بغیر حل نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

اسی طرح اگر کبھی دینی حکم طاقت سے زیادہ تکلیف پر مشتمل ہو اور اس کا اجرا ضروری ہو تو وہ خود بخود لغو ہو جائے گا۔ یہی وہ عوامل ہیں جنہوں نے اسلام کو تحرک و انعطاف بخشا ہے اور ان پر رنگ جاودانی چڑھا دیا ہے۔ اور یہیں سے اسلام کی غیر محدود موازین ہر صورت میں اپنے دوام کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

یہ بہت بڑا اشتباہ ہے کہ تصور کیا جائے کہ ہر نظام و قانون کی محدودیت و ناپائیداری کا سبب جبر تاریخ ہے۔ تاریخ کو گردش دینے والے عوامل کی تاثیر کی میزان کو پیش نظر رکھنا چاہیئے تاکہ ہر ایک کی پائیداری یا ناپائیداری مشخص ہو جائے کیونکہ جبری عوامل تاریخی کی تاثیر جو دیگر عوامل کی طرح قطعی و اجتناب ناپذیر ہیں وہ نوع عامل سے وابستہ ہیں۔ اگر تاریخ ساز عوامل پائیدار ہوں تو ان کا جبری اثر اسی کیفیت سے ہے اور اگر ناپائیدار ہیں تو ان کے نتائج بھی ناپائیدار ہوں گے۔

(۵)

تاریخی عوامل میں سے ایک مذہبی عامل بھی ہے۔ دینداری ایک تاریخی سنت ہے۔ مذہب اور مبدء ہستی کی طرف توجہ نے " جو انسان کے باطن سے جوش مارتا ہے "۔ اپنے نقش کو گوناگوں اشکال اور بشر کی مختلف زندگی کے دوران اچھی طرح سے پورا کیا ہے۔ اور تاریخ کی طبیعت سنت واجب بتاتی ہے کہ یہ مستقل و زندہ

ہویت بھی اسی طرح پائدار ہے۔

یہ زاویۂ دید ہے جو مسائل میں تفکر کرنے کے لئے عینک کا کام دیتی ہے اور اس وقت انتخاب بہت تعصب آمیز ہوتا ہے کہ جب ارزشوں کے ملاک اور ان کی قیمتوں کی ادائیگی کو ایک ایسی بینش سے وابستہ کردیں جو تمام مختلف مسائل وحقائق کو ایک خاص زاویہ میں کھینچ لاتی ہے اور تاریخ کے بنیادی واصلی عامل کو صرف اقتصادی مسئلہ بنادیتی ہے۔

اس نظریہ سے اقتصادی عامل مخصوص جبری مسیر کا دارا ہوتا ہے۔ جو انسانوں کے ارادہ سے خارج نظامہائے ارزش کو درہم وبرہم کردیتی ہے اور اوضاع کو دگرگوں کردیتی ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسیر جبر میں انسانوں کا نقش کیا ہے؟ اور اس برگشت ناپذیر مسیر میں اختیار بشر وآزادی کا مسئلہ جو اس کو دیگر مادی مادی حوادث سے متمایز کرتا ہے اس کو کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے؟

تلخ واقعات کے مقابلے میں بھی انبیائے کرام[ع] نے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ اور ان کی عینیت گرائی محیط کے مرحلہ شناخت میں اور ان کی ہدف گرائی مرحلۂ عمل میں منافات نہیں رکھتی تھی کہ وہ تمام چیزوں کو جبر تاریخ کے کلمہ سے توجیہ کریں۔

پروفیسر گلزمان کہتا ہے:

جس حد تک عدم قبول ضرورت در تاریخ باطل ہے۔ اس مفہوم کا قبول کرنا کہ تاریخ میں ہر چیز ضروری ہے یہ بھی اسی حد تک باطل ہے۔ کوئی بھی انسان اپنی نوع قضاوت کی واقع بینی کو اس قاعدہ پر نہیں پرکھتا کہ بشر کی ایثارگری عشق سے سرشار ہے اور وہ اقدار وملاک کو موجن کردیتا ہے، تن پرستی، تفاخر، خواہشات، حیوانی شہوات کا تمسخر اڑاتی ہے اور خلاقیت کمال، آزادی، حکمت، عدالت کی طرف حرکت کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس کی تمام خصوصیات ایک بُعد ہے۔ تنہا اپنی

انفرادیت کا زندانی ہے۔ خواہشات کا مقہور اور اشیاء کا غلام ہے ـــــ کیونکہ اس قسم کا فیصلہ ہرگز عینی و بے طرفانہ نہیں ہے۔ اور جو لوگ طوفان جبہ گیری میں پڑ گئے ہیں اور اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو بہ عنوان تفسیر عینی مجموع تاریخ اور بنام بے طرفی اعلان کرتے ہیں وہ بے انصافی کرتے ہیں۔

تمام شد در مکہ مکرمہ روز عید غدیر صبح بمطابق ۱۲؍اگست ۸۷ء